Dec 95
229

December 1995 • Issue 229 • Rs. 7

کبھی آگے بڑھنا نتیجہ کے اعتبار سے پیچھے ہٹنا ہوتا ہے
اور کبھی پیچھے ہٹنا
نتیجہ کے اعتبار سے آگے بڑھنا بن جاتا ہے۔
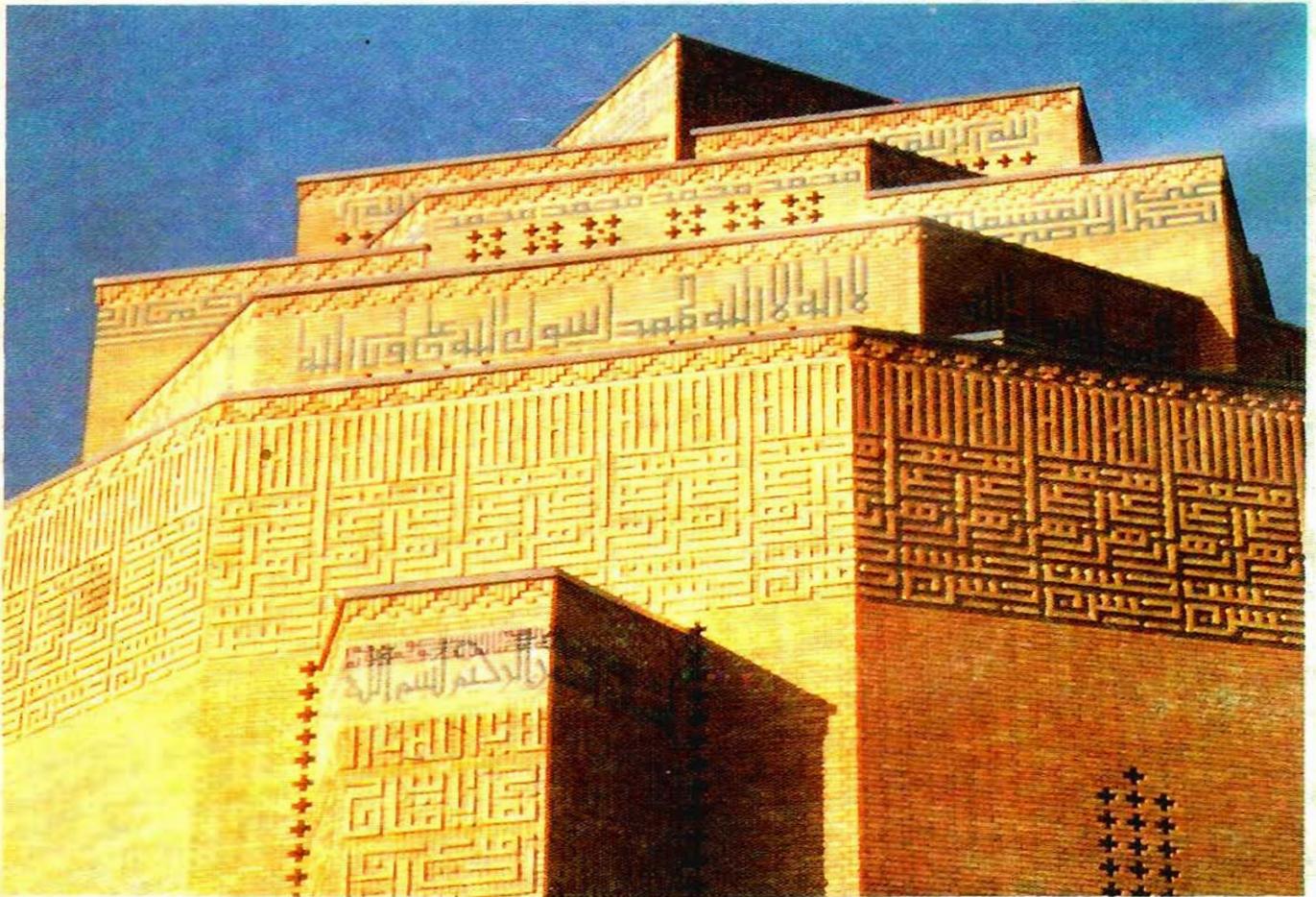
AL-GHADIR MOSQUE (1977), TEHRAN.

زیر سرپرستی

مولانا وحید الدین خاں

صدر اسلامی مرکز

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا اسلامی مرکز کا ترجمان

دسمبر ۱۹۹۵، شمارہ ۲۲۹

فہرست	صفحہ

AL-RISALA (Urdu)

1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110 013, Tel. 4611128, 4697333

Fax: 91-11-4697333

Single copy Rs. 7, Annual subscription Rs. 70, Abroad: $ 20 (Air mail), $ 10 (Surface mail)

Printed and published by Saniyasnain Khan at Nice Printing Press, Delhi

اسلامی اصول

عن حذیفۃ، عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم: قال: لا ینبغی لمسلم أن یذل نفسہ۔ قیل وکیف یذل نفسہ۔ قال یتعرض من البلاء لما لا یطیق۔

(مسند الامام احمد بن حنبل ۵/ ۴۰۵)

حضرت حذیفہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کسی مسلمان کے لئے مناسب نہیں کہ وہ اپنے آپ کو ذلیل کرے۔ پوچھا گیا کہ کوئی شخص کیسے اپنے آپ کو ذلیل کرے گا۔ فرمایا کہ وہ ایسی بلا کا سامنا کرے جس سے وہ مقابلہ کی طاقت نہ رکھتا ہو۔

اس حدیثِ رسول سے اسلامی زندگی کا ایک اہم اصول معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ اجتماعی زندگی میں جب کسی کی طرف سے کوئی بلا یا کوئی ناپسندیدہ صورتحال پیش آئے تو اس وقت یہ درست نہیں ہے کہ آدمی بھڑک کر صاحب بلا سے ٹکرا جائے۔ بلکہ اس کو سوچ سمجھ کر یہ طے کرنا چاہئے کہ دو ممکن راستوں میں سے کونسا راستہ اس کے لئے زیادہ مناسب ہے۔

پہلی صورت یہ ہے کہ آدمی یہ محسوس کرے کہ اس کے پاس اتنی کافی قوت ہے کہ وہ کامیاب طور پر مقابلہ کر کے زیادتی کرنے والوں کو مجبور کر سکتا ہے کہ وہ اپنی زیادتی سے باز آئیں۔ اگر ایسا ہو تو آدمی کو چاہئے کہ وہ جم کر مقابلہ کرے تاکہ فساد ختم ہو اور اصلاح کی حالت قائم ہو جائے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ ٹھنڈے غور و فکر کے بعد آدمی اس نتیجہ پر پہنچے کہ دونوں فریقوں میں طاقت کا تناسب ناقابل عبور حد تک غیر متناسب ہے۔ حالات ایسے ہیں کہ اگر مقابلہ آرائی کا طریقہ اختیار کیا گیا تو برعکس نتیجہ نکلے گا اور چھوٹا نقصان زیادہ بڑا نقصان بن جائے گا۔ اگر ایسا ہو تو لازم ہے کہ آدمی صبر و اعراض کا طریقہ اختیار کرے۔ اور صاحب بلا سے نہ الجھے۔

مزید یہ کہ اعراض کا مطلب بزدلی نہیں ہے بلکہ وقفۂ تیاری ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنے وقت اور اپنی طاقت کو ٹکراؤ سے بچا کر مزید تیاری میں لگائے، وہ اپنے آپ کو زیادہ مستحکم بنانے کی تدبیر کرے۔ تاکہ آئندہ کوئی شخص اس کے خلاف زیادتی کی ہمت نہ کرے، اور اگر کوئی زیادتی کی کارروائی کرے تو آدمی کے پاس اس کے توڑ کے لئے کافی طاقت موجود ہو۔

یہ بھی اسلام کے اصولوں میں سے ایک اہم اصول ہے۔

اثر قبول نہ کرنا

عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا ایک قول ہے کہ لوگوں سے اختلاط کرو اور یہ دیکھتے رہو کہ تم اپنے دین کو زخمی نہ کرلو (خالطوا الناس و انظروا ألّا تکلموا دینکم) فتح الباری لابن حجر العسقلانی ۱۰/۳/۵۴۳

اسلام میں یہ پسندیدہ بات نہیں کہ آپ لوگوں سے ملنا جلنا چھوڑ دیں۔ بلکہ اسلام میں یہ مطلوب ہے کہ آپ ہر قسم کے لوگوں سے ملتے رہیں۔ یہ اختلاط اس لئے بھی ضروری ہے کہ اسلام ایک دعوتی مذہب ہے، اور اختلاط کے بغیر دعوت کا کام نہیں ہوسکتا۔

اس کے علاوہ آپ کی شخصیت کی تکمیل کے لئے بھی اختلاط ضروری ہے۔ جب آپ لوگوں سے ملتے جلتے ہیں تو بار بار ایسے حالات پیش آتے ہیں جو آپ سے کسی ردعمل کا تقاضا کرتے ہیں۔ مثلاً کسی آدمی نے کڑوی بات کہہ دی۔ اب آپ کو اس کا جواب دینا ہے۔ کسی سے آپ نے ایک وعدہ کرلیا، اسے آپ کو پورا کرنا ہے۔ کسی کی کوئی امانت آپ کے پاس آگئی جسے آپ کو ادا کرنا ہے۔ اس طرح کے معاملات کے دوران ہی آپ تربیت پاکر اسلامی اخلاق کے مالک بنتے ہیں۔

تاہم اختلاط کا یہ نتیجہ نہیں ہونا چاہئے کہ آپ دوسروں کا غلط اثر قبول کرلیں۔ مثلاً ایک خاتون نے ایک صاحبہ کو اپنی سہیلی بنایا۔ خاتون سادہ انداز میں رہتی تھیں اور سہیلی کے اندر فیشن والا مزاج تھا۔ سہیلی نے بار بار خاتون سے کہنا شروع کیا کہ تم کیا یہ بیوہ عورتوں کی طرح بالکل سادہ کپڑے پہنتی ہو۔ اس طرح کی باتیں کرکے سہیلی نے مذکورہ خاتون کو رنگین کپڑوں کی طرف راغب کیا پھر ان کے ڈھیلے کپڑے کی جگہ چست کپڑے سلوائے۔ اس طرح سہیلی کے اثر سے خاتون کی ایک ایک چیز بدلنے لگی۔ یہاں تک کہ وہ باقاعدہ فیشن پسند ہوگئیں اور روزانہ ان کے کئی کئی گھنٹے صرف میک اپ کی نذر ہونے لگے۔

مسلمان کو چاہئے کہ وہ اپنی دینی شخصیت کا ہمیشہ محافظ بنا رہے۔ وہ دوسروں سے اثر قبول کرنے کے بجائے خود دوسروں پر اپنا اثر ڈالنے کی کوشش کرے۔ وہ لوگوں کے درمیان داعی بن کر رہے، نہ کہ خود دوسروں کا مدعو بن جائے۔

اسلامی کلچر

قرآن میں رب العالمین ہے، رب القوم نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام آفاقیت کو پسند کرتا ہے نہ کہ محدودیت کو۔ قرآن میں پیغمبر کو رحمت عالم کہا گیا ہے، آپ کو زحمت عالم نہیں کہا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام محبت کا مذہب ہے، وہ نفرت کا مذہب نہیں۔ قرآن میں الصلح خیر ہے، قرآن میں الحرب خیر نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام صلح کا ماحول لانا چاہتا ہے نہ کہ جنگ اور ٹکراؤ کا ماحول۔

قرآن میں حکم دیا گیا ہے کہ پڑھو (اقرأ)، یہ نہیں فرمایا کہ گولی مارو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام علم کلچر کا نام ہے نہ کہ گن کلچر کا۔ قرآن میں صبر پر زور دیا گیا ہے، قرآن میں بے صبری کی تعلیم نہیں دی گئی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام یہ چاہتا ہے کہ لوگوں کی ایذاؤں پر تحمل سے کام لیا جائے، نہ یہ کہ کسی سے ایذا پہنچے تو مشتعل ہو کر اس سے لڑائی شروع کر دی جائے۔ قرآن میں بلند اخلاقی (خلق عظیم) کی تعریف کی گئی ہے نہ کہ برابری کے اخلاق کی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کے نزدیک صحیح طریقہ یہ ہے کہ دوسروں کے سلوک کو نظر انداز کر کے ان کے ساتھ اعلیٰ اخلاق کا معاملہ کیا جائے۔

ان چند حوالوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام کیا ہے۔ اور اسلامی کلچر حقیقۃً کسے کہتے ہیں۔ اسلام خداوند عالم کی حیثیت خداوندی کا ظہور ہے۔ اسلام ساری کائنات کا دین ہے۔ اسلام وسیع تر انسانیت کا نمائندہ ہے۔ ایسی حالت میں اسلام کی وہی تشریح درست ہو گی جو اس کی ان حیثیتوں سے مطابقت رکھتی ہو۔ جو تشریح اسلام کے ان اعلیٰ تقاضوں کے مطابق نہ ہو وہ صحیح اسلامی تشریح بھی نہیں۔

سچا اسلام وہ ہے جو لوگوں کے اندر خدا کا خوف پیدا کرے۔ جو لوگوں میں دنیا پرستی کے مقابلہ میں آخرت پسندی کا ذہن بنائے۔ جو لوگوں کے دلوں میں انسان کی محبت پیدا کرے۔ جو لوگوں کو اپنے اور غیر کا فرق کئے بغیر سب کا خیر خواہ بنائے۔ جس کا نتیجہ یہ ہو کہ آدمی اپنے حقوق سے زیادہ اپنی ذمہ داریوں پر نظر رکھنے لگے۔

اسلام جن لوگوں کے دلوں میں اترتا ہے وہ انھیں رحمت اور سلامتی کا پیکر بنا دیتا ہے۔ اسلام اور نفرت وعداوت دونوں ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتے۔

اشاعت اسلام

ہندو دھرم میں یہ مانا گیا ہے کہ سچائی ایک ہے، مگر اس کے راستے جدا جدا ہیں۔ وہ مختلف مذاہب کو سچائی کے مختلف راستے تصور کرتا ہے۔ چنانچہ ہندو دھرم ہر مذہب کے احترام کی اپیل کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پچھلے ہزار سال سے ہندستان میں مذہب بدلنے کا عمل جاری ہے۔ مگر ہندو دھرم پر عقیدہ رکھنے والوں نے کبھی اس کو برا نہیں مانا، کیوں کہ ان کے عقیدہ کے مطابق، یہ سچائی کی طرف جانے والے ایک راستہ کے بجائے دوسرے راستہ کے ذریعہ سچائی کی طرف اپنا سفر جاری رکھنے کے ہم معنی تھا۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی کتاب ڈسکوری آف انڈیا میں لکھا ہے کہ ہندستان میں مذہب کی تبدیلی پر اگر کوئی اعتراض کرتا ہے تو وہ سیاسی سبب سے ہوتا ہے نہ کہ مذہبی سبب سے۔

ہندو سنسکرتی کی یہ روایت ۱۹۴۷ کے بعد ملک کے کانسٹی ٹیوشن (دستور) میں بھی باقاعدہ طور پر شامل کر دی گئی۔ چنانچہ دستور کی دفعہ ۲۵ میں ملک کے ہر شہری کا یہ ناقابل تنسیخ بنیادی حق قرار دیا گیا ہے کہ وہ جس مذہب کو چاہے مانے، جس مذہب پر چاہے عمل کرے اور جس مذہب کی چاہے تبلیغ کرے۔

اسی آزادانہ فضا کا یہ نتیجہ ہے کہ ۱۹۴۷ سے پہلے بھی ہندستان میں کثرت سے لوگ اسلام قبول کرتے رہے، اور آج بھی ہر روز ملک کے مختلف علاقوں میں لوگ اپنی ضمیر کی آواز کے تحت مسلسل اسلام قبول کر رہے ہیں۔ مثال کے طور پر دہلی کے انگریزی روزنامہ ٹائمس آف انڈیا کے شمارہ ۲۵ جون ۱۹۹۵ میں صفحہ ۱۳ پر نام کی تبدیلی (Change of Name) کے زیر عنوان یہ اعلان شائع ہوا ہے:

I, Arvind Kumar, son of Shri Prem Kumar, r/o 67/6, Zamrud Pur, Greater Kailash Part-1, New Delhi 110048, by faith Hindu, would hereafter be called as Ateeq and has embraced Islam. (The Times of India, New Delhi, June 25, 1995)

میں اروند کمار ولد شری پریم کمار ساکن زمرد پور، گریٹر کیلاشس، نئی دہلی، ہندو مذہب سے تعلق رکھنے والا، اب عتیق کے نام سے پکارا جائے گا، اور میں نے اسلام قبول کر لیا ہے۔

قیادت کی تربیت

ایک مشہور مسلم شاعر کا نماز کے بارہ میں دو شعر یہ ہے:

قوم کیا چیز ہے قوموں کی امامت کیا ہے — اس کو کیا جانے یہ بیچارے دو رکعت کے امام

ملا کو جو ہے ہند میں سجدہ کی اجازت — ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

یہ بات موجودہ دور زوال کی نمازوں کو دیکھ کر کہی گئی ہے۔ اصل نماز اگر اپنی روح کے ساتھ زندہ ہو تو خود مذکورہ شاعر کے مطابق، وہ ایک عظیم انقلابی چیز بن جائے گی:

وہ سجدہ روح زمیں جس سے کانپ جاتی تھی — اسی کو آج ترستے ہیں منبر و محراب

حقیقت یہ ہے کہ نماز پوری زندگی کے لئے ایک تربیت ہے۔ نماز ایک اعتبار سے مسجد کا ایک وقتی عمل ہے اور دوسرے اعتبار سے وہ ایسا انقلاب انگیز عمل ہے جو انسانی زندگی میں ہمہ گیر نتائج پیدا کرنے والا ہے۔

نماز کے مختلف پہلوؤں میں سے ایک پہلو وہ ہے جس کا تعلق امامت سے ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب نماز کا وقت آئے تو تم میں سے ایک شخص اذان دے اور تم میں سے جو آدمی سب سے بڑا ہو وہ تمہاری امامت کرے (واذا حضرتِ الصلاۃ فلیؤذن لکم احدکم ولیؤمکم اکبرکم) ایک اور روایت میں ہے کہ یؤم القوم اقرؤھم لکتاب اللہ) فتح الباری ۲/۲۰۰

اکبر اور اقرأ (زیادہ علم والا) دونوں ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ لوگوں کو چاہئے کہ وہ ایسے شخص کی امامت پر راضی ہو جایا کریں جو ان کے درمیان زیادہ پختہ کار اور زیادہ واقف کار ہو۔ جو آدمی علم اور عمر میں بڑا ہو گا۔ اس کے اندر لازماً یہ صفتیں دوسروں سے زیادہ پائی جائیں گی۔

اس طرح مسجد میں یہ تربیت دی جاتی ہے کہ اجتماعی معاملات میں مسلمان کس طرح رہیں۔ وہ اس طرح رہیں کہ جب بھی کوئی اجتماعی معاملہ ہو تو پختگی اور واقفیت میں جو لوگ کم ہوں وہ اپنے کو پیچھے کر لیں اور جو آدمی پختگی اور واقفیت میں زیادہ ہے اس کو اپنا قائد بنانے پر راضی ہو جائیں۔

پر عافیت زندگی

ایک عالم کے حلقہ میں ایک شخص تھا جو ان سے بہت زیادہ قریب تھا۔ وہ اس کو دوسروں سے زیادہ مانتے تھے، اور دوسروں سے زیادہ ان پر بھروسہ کرتے تھے۔ عالم نے اس شخص کو ایک کاروبار پر لگا دیا۔ اس میں اسے کامیابی ہوئی اور وہ پیسہ والا آدمی بن گیا۔

اس کے بعد ایک روز وہ مذکورہ عالم کی صحبت میں تھا۔ کسی بات پر عالم نے اس کو سختی سے منع کیا۔ وہ شخص بگڑ گیا۔ اس نے سخت انداز میں جواب دیا اور اٹھ کر عالم کے پاس سے چلا گیا۔ چند دن کے بعد اس کا غصہ ٹھنڈا ہوا تو وہ دوبارہ آیا اور عالم سے معذرت کرنے لگا۔ عالم نے جواب دیا کہ تم کو معذرت کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں پہلے ہی اس معاملہ کو اس طرح ختم کر چکا ہوں کہ اب تک میں تم کو اپنے معیار سے دیکھتا تھا، اب میں تم کو تمہارے معیار سے دیکھوں گا۔

اس دنیا میں عافیت کی زندگی گزارنے کا یہی واحد کامیاب اصول ہے۔ ایک لفظ میں اس کا خلاصہ یہ ہے کہ — لوگوں سے خود ان کے لحاظ سے معاملہ کرو نہ کہ اپنے لحاظ سے۔

ایک آدمی زیادہ امید پر پورا نہیں اترتا تو اس سے اپنی امید کو کم کر لیجئے۔ ایک آدمی آپ کی پابندی کو قبول نہیں کرتا تو اس سے پابندی کا مطالبہ کرنا چھوڑ دیجئے۔ ایک شخص آپ کا خاص آدمی بننے کے لئے تیار نہیں ہے تو اس کو عام آدمیوں میں شمار کرنا شروع کر دیجئے۔ ایک آدمی پر آپ کا قابو نہیں چلتا تو اس سے موافقت کی روش اختیار کر لیجئے۔ ایک آدمی آپ کو دینے کے لئے تیار نہیں ہے تو اس سے اپنی توقعات کو ختم کر دیجئے۔ ایک آدمی اس خانہ کا اہل نظر نہیں آیا جہاں آپ نے اس کو رکھا تھا تو آپ سادہ طور پر صرف یہ کیجئے کہ ایک خانہ سے نکال کر اس کو دوسرے خانہ میں ڈال دیجئے۔

زندگی خارجی حقیقتوں سے موافقت کرنے کا نام ہے۔ سورج اور ہوا اور بارش اور پہاڑ اور سمندر سے موافقت کر کے ہی ہم اس دنیا میں زندگی گزارتے ہیں۔ یہی اصول انسانوں کے بارہ میں بھی ہے۔ آپ انسانوں سے موافقت کے اصول پر معاملہ کیجئے، اور دنیا آپ کے لئے خوشی اور عافیت کا گہوارہ بن جائے گی۔

تنقید و اختلاف

تنقید کو بند کرو، اختلاف رائے کو ختم کرو، تاکہ امت میں اتحاد ہو سکے —— یہ جملہ قواعد کے اعتبار سے درست ہے، مگر وہ حقیقت کے اعتبار سے بالکل بے معنی ہے۔ کیوں کہ تنقید و اختلاف انسانی زندگی کا لازمی حصہ ہے، اس لئے وہ کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔ زیادہ صحیح اور قابل عمل بات یہ ہے کہ تنقید کو گوارا کرو، اختلاف رائے کو برداشت کرو تاکہ امت میں اتحاد ہو سکے۔ کسی قوم میں اتحاد ہمیشہ اسی دوسرے اصول کی بنیاد پر ہوتا ہے، اور امت مسلمہ میں بھی اتحاد اسی بنیاد پر ہوگا۔ اس کے سوا اتحاد کی دوسری کوئی صورت نہیں۔

صحابہ و تابعین کے درمیان اختلافات تھے۔ اسی طرح محدثین، فقہاء، علماء، صوفیاء سب کے درمیان کثرت سے اختلافات تھے۔ حتیٰ کہ قرآن سے ثابت ہے کہ دنیا میں بیک وقت دو پیغمبر ہوں تو ان کے درمیان بھی کبھی اختلاف ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں اختلاف کو ختم کر کے اتحاد قائم کرنے کی شرط نہ صرف غیر فطری ہے بلکہ وہ غیر شرعی بھی ہے۔

تنقید و اختلاف کوئی برائی نہیں۔ وہ فکری ارتقاء کا ذریعہ بنتی ہے۔ مثال کے طور پر غزوۂ بدر کے موقع پر ایک صحابی نے پیغمبر سے اختلاف کیا۔ اس کے نتیجہ میں زیادہ بہتر میدان جنگ کا انتخاب ممکن ہو گیا۔ وغیرہ۔

اصل یہ ہے کہ انسان دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک طالب خواہش اور دوسرا طالب حق۔ طالب خواہش اپنی ذات میں جیتا ہے۔ اس کی ساری دل چسپی اس میں ہوتی ہے کہ اس کی اپنی شخصیت نمایاں ہو۔ اس کی بڑائی تسلیم کی جائے۔ یہی وہ آدمی ہے جو تنقید و اختلاف سے بھڑکتا ہے۔ کیوں کہ وہ محسوس کرتا ہے کہ تنقید اس کی شخصی عظمت کو گھٹا رہی ہے۔

طالب حق کی نفسیات اس سے بالکل جدا ہوتی ہے۔ وہ صرف حق کا طالب ہوتا ہے۔ وہ تنقید کو اپنی ذات پر حملہ نہیں سمجھتا۔ وہ تنقید کو صرف اس نظر سے دیکھتا ہے کہ وہ حق ہے یا ناحق۔ تنقید اگر غلط ہے تو وہ سادہ طور پر اسے نظر انداز کر دیتا ہے۔ لیکن تنقید اگر برحق ہے تو وہ فوراً اس کو قبول کر لے گا۔ کیونکہ ایسی تنقید میں اس کو عین وہی چیز ملتی ہوئی نظر آئی جو پہلے سے اس کا مطلوب و مقصود تھی۔

غاصب، مغصوب

جب کوئی غاصب کسی کی چیز غصب کرتا ہے تو بظاہر غاصب پانے والا ہوتا ہے اور مغصوب کھونے والا۔ مگر اصل حقیقت اس کے برعکس ہے۔ وسیع تر نگاہ سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ غاصب محروم ہے، اور جو مغصوب ہے وہی وہ شخص ہے جس نے حاصل کیا۔

اس فرق کا سبب یہ ہے کہ غاصب کو اس کا عمل سمٹاؤ کی طرف لے جاتا ہے۔ اس کو معلوم ہوتا ہے کہ اس نے استحقاق کے بغیر ایک چیز پر قبضہ کیا ہے، اس لئے وہ ہر آن یہ سوچتا رہتا ہے کہ ملی ہوئی چیز پر اپنے قبضہ کو بحال رکھے۔ وہ تحفظ کی نفسیات میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس کی ساری سوچ بس ملی ہوئی چیز پر مرتکز ہو جاتی ہے۔ وہ محدودیت کے خول میں بند ہوتا چلا جاتا ہے۔

دوسری طرف مغصوب کی صورت حال اس کو پھیلاؤ کی طرف لے جاتی ہے۔ وہ اپنے دائرہ سے نکل کر چاروں طرف دیکھنے لگتا ہے کہ کہاں کوئی موقع ملے جس کو استعمال کرکے وہ مزید کچھ حاصل کرے اور اس طرح اپنے کھونے کی تلافی کر سکے۔ پہلے اگر وہ محدود دائرہ میں جی رہا تھا تو اب وہ آفاقیت کی طرف بڑھنا شروع کر دیتا ہے۔

یہ فرق دونوں کے لئے الگ الگ نتیجہ پیدا کرتا ہے۔ غاصب کا یہ حال ہوتا ہے کہ وہ جہاں تھا وہیں ٹھہر کر رہ جاتا ہے۔ غصب کے ذریعہ اس نے جو چیز پائی تھی وہی اس کی آخری یافت بن جاتی ہے۔ فکری اور عملی دونوں اعتبار سے وہ ایک غیر ترقی پذیر مخلوق بن کر رہ جاتا ہے۔

اس کے برعکس معاملہ مغصوب کا ہوتا ہے۔ اس کا تجربہ اس کو سراپا عمل بنا دیتا ہے۔ وہ ایک مسلسل ترقی کی راہ پر چل پڑتا ہے۔ اس کے دماغ میں یہ بات بھر جاتی ہے کہ اس کو مزید حاصل کرنا ہے۔ یہ مزاج اس کو دائماً متحرک رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ پہلے سے بھی زیادہ کامیاب زندگی حاصل کر لیتا ہے۔ جو آدمی ایک بار غصب کا معاملہ کرلے اس نے گویا اپنے آپ کو ایک خول میں بند کر لیا۔ اس کے برعکس جس شخص کے ساتھ غصب کا واقعہ ہوا ہے وہ اپنے خول سے نکل آئے گا اور وسیع تر دنیا میں دوبارہ اپنے لئے نیا مقام حاصل کرنا چاہے گا۔ غاصب کو اس کا فعل محدودیت کی طرف لے جاتا ہے اور مغصوب کو اس کا تجربہ وسعت اور پھیلاؤ کی طرف۔

شعور نہ کہ نظام

موجودہ زمانہ میں جاپان کی غیر معمولی ترقی ایک تسلیم شدہ حقیقت بن چکی ہے۔ جاپان نے یہ ترقی احتجاجی مظاہروں کے ذریعہ حاصل نہیں کی۔ بلکہ اپنے افراد کے اندر شعور پیدا کر کے حاصل کی ہے۔ جاپانی امور کے ایک ماہر رابرٹ ہیز (Robert Hayes) نے لکھا ہے کہ جاپان نے اپنے افراد کے لئے معیار کو ایک طرز فکر (Way of thinking) بنا دیا۔ اس سلسلہ میں انھوں نے یہ الفاظ لکھے ہیں :

> You don't get quality into a product by inspection, you have to build it in.

معیاری پیداوار کو آپ انسپکٹروں کی جانچ کے ذریعہ حاصل نہیں کر سکتے۔ آپ کو ہر ایک کارکن کے اندر اس کا احساس پیدا کرنا ہوگا (ہندستان ٹائمس ۲۸ دسمبر ۱۹۸۶، صفحہ ۹)

امریکہ نے دوسری عالمی جنگ میں اور اس کے بعد جاپان کے ساتھ جو کچھ کیا تھا، اس کے مطابق امریکہ جاپان کے لئے دشمن نمبر ایک کی حیثیت رکھتا تھا۔ جاپان نے جنگ کے بعد جو اپنی تعمیر نو شروع کی تو پہلا کام یہ کیا کہ اپنے افراد کو منفی طرز فکر سے پاک کیا۔ اس نے نفرت اور انتقام کے احساسات سے اوپر اٹھ کر امریکیوں سے معاملہ کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جاپان اس سے بچ گیا کہ وہ اپنی طاقت کو غیر ضروری قسم کی منفی کارروائیوں میں صرف کرے۔ منفی نفسیات سے اوپر اٹھنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے خود اپنے دشمن کو اپنی خوراک بنالیا۔

امریکہ کی بیل لیبارٹریز (Bell Laboratories) نے سب سے پہلے ٹرانسسٹر ایجاد کیا تھا۔ جاپانی اگر امریکہ کے خلاف نفرت کے جذبات اپنے سینہ میں لئے ہوئے ہوتے تو وہ امریکہ سے کچھ سیکھ نہیں سکتے تھے۔ مگر ان کے مثبت طرز فکر کا یہ نتیجہ ہوا کہ انھوں نے فوراً اس ایجاد کو پکڑ لیا۔ قبل اس کے کہ بیل لیبارٹریز ٹرانسسٹر بنائے جاپانیوں نے بہت بڑی مقدار میں ٹرانسسٹر بنا کر عالمی مارکیٹ پر قبضہ کر لیا۔ اسی طرح فبکس کی تکنیک امریکہ میں دریافت ہوئی۔ مگر جاپان نے سب سے پہلے اس کا تجارتی فائدہ حاصل کیا۔

اکثریت کی آواز

ٹائمس آف انڈیا (یکم جنوری ۱۹۹۱) میں مسٹر بینی پرساد اگروال نے ملکی حالات پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ہمارا ملک اس وقت رام جنم بھومی اور بابری مسجد کے مسئلہ پر اختلافات کا بری طرح شکار ہو رہا ہے۔ میرے ذہن میں یہ آتا ہے کہ وہ لوگ جو اس مقام پر ہر قیمت پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں تاکہ وہ وہاں رام مندر بنا سکیں، انھوں نے اپنے آپ سے ایک سادہ مگر اہم سوال دریافت نہیں کیا ہے۔ وہ یہ کہ رام خود اس بارے میں کیا کہیں گے۔ رام کو معقولیت اور حسن اخلاق کا اعلیٰ نمونہ سمجھا جاتا ہے۔ اور ان کی زندگی کی کہانی میں بے شمار واقعات ہیں جو بتاتے ہیں کہ غصہ اور انتقام کے مقابلہ میں معاف کر دینا زیادہ عظیم ہے۔ کیا ایسا ایک شخص اس کی اجازت دے گا کہ ایک اور مذہب کی عبادت گاہ پر جبراً اس کا مندر بنایا جائے:

Our country is presently torn apart by the controversy over Ramjanmabhoomi-Babri Masjid issue. It occurs to me that those who demand the site at any cost in order to build a Ram temple, have not asked themselves a simple but important question as to what Lord Ram himself would have said on this. Lord Ram is known as the supreme human example of propriety and there are innumerable instances in his life's story which exemplify that forgiveness is greater than revenge or anger. Would such a person have permitted the forcible removal of a place of worship of another religion in order to build a temple for him? (Beni Prasad Agarwal)

مسٹر بینی پرساد اگروال نے جو بات کہی تھی، اس طرح کی باتیں مسلسل ہندو حضرات مختلف صورتوں میں کہتے رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندو فرقہ میں کم از کم ۹۰ فیصد اسی قسم کے لوگ ہیں جن کی ایک نمائندگی مسٹر اگروال نے کی۔ جنوبی ہند کے ہندو تقریباً صد فی صد اسی ذہن کے ہیں۔ شمالی ہند میں کچھ انتہا پسند ہندو ہیں۔ مگر وہ اقلیت میں ہیں۔

مگر مسلمانوں کی نااہل لیڈرشپ اس امکان کو سمجھ نہ سکی۔ اس نے نہایت احمقانہ طور پر بابری مسجد کے مسئلہ کو سارے ملک کے لئے ایجی ٹیشن اور ہنگامہ آرائی کا مسئلہ بنا دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مذکورہ امکان استعمال ہونے سے رہ گیا۔ یہاں تک کہ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو بابری مسجد ڈھادی گئی۔

بے عملی کا سبب

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مکہ میں قرآن کی دعوت کا اعلان کیا تو وہاں کے بیشتر لوگوں نے اس کو ماننے سے انکار کر دیا۔ اس انکار کی وجہ وہی قدیم نفسیات تھی جو پچھلے پیغمبروں کے انکار کا باعث بنی تھی۔ اس سلسلہ میں قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

اور جب ان کے پاس ہدایت آگئی تو ان کو ایمان لانے سے اس کے سوا اور کوئی چیز مانع نہیں ہوئی کہ انھوں نے کہا کہ کیا اللہ نے بشر کو رسول بنا کر بھیجا ہے۔ کہو کہ اگر زمین میں فرشتے ہوتے جو اس میں چلتے پھرتے تو البتہ ہم ان پر آسمان سے فرشتہ کو رسول بنا کر بھیجتے (بنی اسرائیل ۹۴ - ۹۵)

پیغمبر لوگوں کے پاس ہدایت لے کر آیا۔ مگر وہ اس سے فائدہ نہ اٹھا سکے۔ اس کی وجہ کیا تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ پیغمبر کو ان کے لئے انسانی نمونہ بنا کر بھیجا گیا تھا۔ مگر وہ اس کو آسمانی پیکر کے روپ میں دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ اس حقیقت کو سمجھ نہ سکے کہ پیغمبر اگر آسمانی پیکر کے روپ میں آئے تو وہ ان کے لئے نمونہ کیسے بنے گا۔ انسانی عمل کے لئے نمونہ وہی شخصیت بن سکتی ہے جس پر انسانی تجربات گزریں۔ جو انسانی طاقت اور انسانی ضعف کے ساتھ دنیا میں رہے۔ جو پیغمبر انسانی اوصاف سے ماورا ہو وہ کسی غیر انسانی مخلوق کے لئے نمونہ ہو سکتا ہے۔ مگر وہ انسان جیسی مخلوق کے لئے نمونہ نہیں بن سکتا۔

موجودہ زمانہ کا کیس بھی عملی نتیجہ کے اعتبار سے یہی ہے۔ قدیم زمانہ کے منکر پیغمبروں سے اس لئے حیات انسانی کا نمونہ نہ لے سکے کہ وہ انھیں برتر مخلوق کے روپ میں دکھائی نہیں دیا۔ موجودہ مسلمان اس لئے پیغمبر سے نمونہ حاصل کرنے میں ناکام ہیں کہ وہ پیغمبر کو ہیرو پیغمبر کے روپ میں دیکھتے ہیں نہ کہ اسوہ پیغمبر کے روپ میں۔ ہیرو فخر کے لئے ہوتا ہے نہ کہ تقلید کے لئے۔ ہیرو کو دیکھ کر قصیدہ خوانی کا جذبہ ابھرتا ہے نہ کہ اس کی پیروی کرنے کا۔ یہی موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کے ساتھ پیش آیا ہے۔ انھوں نے پیغمبر کو اپنا قومی ہیرو بنا لیا۔ اس لئے وہ پیغمبر کے لئے بڑے بڑے الفاظ بول کر خوش ہوتے ہیں۔ مگر پیغمبر جیسا عمل کرنے کا جذبہ ان کے اندر نہیں ابھرتا۔

مذہب کا غلط استعمال

انگریزی روزنامہ ٹائمس آف انڈیا (۸ مارچ ۱۹۹۵) میں مسٹر کے آر ملکانی کا ایک خط چھپا تھا جس میں انھوں نے دعویٰ کیا تھا کہ اسلام دہشت گردی اور فرقہ بندی کو فروغ دیتا ہے۔ اس کی تردید میں دہلی کے ایک تعلیم یافتہ ہندو مسٹر این کنجو (N. Kunju) کا خط ٹائمس آف انڈیا ۹ مارچ میں شائع ہوا ہے۔

مسٹر کنجو لکھتے ہیں کہ خرابی خود مذہب میں نہیں ہوتی، مذہب کا نام لینے والے اس کو غلط مقاصد کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ سیاست دانوں نے ہمیشہ مذہب کو اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے استعمال کیا ہے۔ گاندھی جی نے ہندو ازم کو عدم تشدد کی تبلیغ کے لئے استعمال کیا تھا۔ اب اسی ہندو ازم کو مسٹر ملکانی کی پارٹی (بی جے پی) فرقہ وارانہ تشدد اور نفرت کے لئے استعمال کر رہی ہے:

Politicians have always used religion to attain their objective. Gandhiji used Hinduism to spread non-violence, while Mr Malkani's party and 'parivar' use it to spread communal violence and hatred. (p. 10).

پریس اور ڈیموکریسی کے دور میں بدقسمتی سے ہر مذہب کے لوگ یہی کر رہے ہیں۔ خود مسلم لیڈروں نے بھی بہت بڑے پیمانے پر اسلام کو اپنے سیاسی مقاصد کے حصول کے لئے استعمال کیا ہے۔ مسلم علاقوں میں اس وقت جگہ جگہ جہاد کے نام پر جو خوں ریزی اور تباہی ہو رہی ہے وہ سب اسی استحصالی ذہنیت کا نتیجہ ہے۔

اس مذہبی برائی کو قرآن میں آیات الٰہی کے بدلے دنیا خریدنا کہا گیا ہے اور اس سے نہایت سختی کے ساتھ منع کیا گیا ہے (لا تشتروا بآیاتی ثمنا قلیلا)

سیاست اور اقتدار کے کھیل کو اگر سیاست اور اقتدار کے نام پر کھیلا جائے تو یہ بھی اگرچہ گناہ ہے مگر وہ چھوٹا گناہ ہے۔ لیکن اگر سیاست بازی اور اقتدار پسندی کا ہنگامہ مذہب کے نام پر جاری کیا جائے تو وہ گناہ کبیرہ اور جرم عظیم بن جاتا ہے۔

بعضکم من بعض

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ جو عورت اور مرد آسمان اور زمین کی نشانیوں میں غور کرتے ہیں وہ تخلیق کے اس نظام میں خالق کے وجود کو پا لیتے ہیں۔ وہ پکار اٹھتے ہیں کہ کائنات کے خالق نے اس کو بے مقصد نہیں بنایا۔ پھر خالق کی دریافت ان کو داعی حق کی دریافت تک پہنچاتی ہے۔ وہ اس کا اعتراف کرکے اس کا ساتھ دیتے ہیں تاکہ آخرت میں ان کو نجات یافتہ گروہ میں شامل ہونے کی سعادت حاصل ہو۔ اس کے بعد قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

ان کے رب نے ان کے حق میں ان کی دعا قبول فرمائی اور کہا کہ میں تم میں سے کسی کا عمل ضائع کرنے والا نہیں، خواہ مرد ہو یا عورت، تم سب ایک دوسرے سے ہو۔ پس جن لوگوں نے ہجرت کی اور جو اپنے گھروں سے نکالے گئے اور میری راہ میں ستائے گئے اور وہ لڑے اور مارے گئے، ان کی خطاؤں کو ضرور میں ان سے دور کردوں گا۔ اور ان کو ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ یہ ان کا بدلہ ہے اللہ کے یہاں اور بہترین بدلہ اللہ ہی کے پاس ہے (آل عمران ۱۹۵)

قرآن کے اس بیان میں مرد اور عورت کے لئے بعضکم من بعض (آل عمران ۱۹۵) کا لفظ آیا ہے۔ یعنی تم آپس میں ایک دوسرے کا جزء ہو:

You are members, one of another.

دوسرے لفظوں میں یہ کہ عورت مرد کا نصف آخر ہے، اور مرد عورت کا نصف ثانی۔ گویا قرآن کے مطابق، مرد اور عورت دونوں ایک دوسرے کے شریک حیات ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے لئے یکساں حصہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے لئے برابر کے ساتھی ہیں۔ انسانی مرتبہ کے لحاظ سے دونوں میں کوئی فرق و امتیاز نہیں۔ جو درجہ ایک کا ہے وہی درجہ دوسرے کا ہے۔

فرق کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ہے جسمانی فرق، دوسرا ہے انسانی فرق۔ جسمانی فرق مرد اور مرد، عورت اور عورت میں بھی ہوتا ہے۔ اسی طرح عورت اور مرد کے درمیان بھی جسمانی فرق پایا جاتا ہے۔ مگر جس طرح مرد اور مرد یا عورت اور عورت میں جسمانی فرق سے انسانی فرق واقع نہیں ہوتا۔ اسی طرح

عورت اور مرد کے درمیان جسمانی فرق کا مطلب یہ نہیں کہ دونوں جنسوں کے درمیان انسانی فرق کیا جائے۔ میدان کار کے اعتبار سے دونوں میں تقسیم ہے مگر انسانی مرتبہ کے اعتبار سے دونوں میں کوئی تقسیم نہیں۔

جیسا کہ قرآن میں بتایا گیا ہے، دنیا کی طرح آخرت میں بھی مرد اور عورت کا معاملہ یکساں ہے۔ دونوں کا یکساں طور پر حساب لیا جائے گا۔ دونوں کے قول وعمل کو ایک ہی معیار پر جانچا جائے گا۔ جو چیز مرد کے لئے نجات کا ذریعہ ہوگی، وہی عورت کے لئے بھی نجات کا ذریعہ ہوگی۔ اور جو چیز عورت کی فلاح وکامیابی کا فیصلہ کرے گی وہی مرد کے لئے بھی فلاح وکامیابی کی ضامن ہوگی۔

جانچ کا وہ معیار کیا ہے، مذکورہ آیتوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ معیار یہ ہے ــــ کائنات میں غور وفکر سے معرفت حاصل کرنا، خداوند عالم کا اقرار، خدا کے پیغمبر پر ایمان، آخرت کی تڑپ، خدا کے لئے ہجرت۔ خدا کی راہ میں جدوجہد، تقوی اور خشوع، صبر۔

کائنات معرفت کا خزانہ ہے۔ مرد اور عورت جب اس میں گہرائی کے ساتھ غور کرتے ہیں تو ان کو اس سے روحانی غذا ملتی ہے، ان کو اس میں حق کی تجلیاں دکھائی دیتی ہیں۔ اس طرح کائنات میں غور کرکے وہ خالق کائنات کو پا لیتے ہیں۔

کائنات کی معنویت اور خدا کی موجودگی کی دریافت ان کو بتاتی ہے کہ کوئی مرد یا عورت اس دنیا میں آزاد نہیں ہو سکتا۔ ضروری ہے کہ ہر ایک سے اس کے قول وعمل کا حساب لیا جائے۔ اور اس کے ریکارڈ کے مطابق اس کو اس کا بدلہ دیا جائے۔ وہ خدا پر ایمان کے ساتھ پیغمبر خدا پر ایمان کے لئے بھی مجبور ہو جاتا ہے کیوں کہ پیغمبر کی رہنمائی کے بغیر خدا کی عبادت واطاعت نہیں کی جا سکتی۔

ہجرت سے مراد محض ترک وطن نہیں ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی مرد یا عورت اللہ کی خاطر ان چیزوں کو چھوڑ دے جن سے اللہ نے منع کیا ہے۔ نامطلوب کو چھوڑنا اور مطلوب کو لینا، یہ ایک مستقل عمل ہے جو مومن اور مومنہ کی پوری زندگی میں ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ اس طرح ان کی زندگی سراپا جدوجہد کی زندگی بن جاتی ہے۔ اس عمل کے دوران وہ بار بار تقوی اور خشوع کی کیفیات کا تجربہ کرتے ہیں۔ وہ اللہ کی خاطر صبر کرنے والے بن جاتے ہیں۔

فخر و ناز

قدیم اسپین میں مسلمانوں کی حکومت ملک کے بڑے حصہ پر قائم ہوگئی تھی۔ تاہم اسپین کا شمالی علاقہ ہمیشہ مسیحیوں کے قبضہ میں رہا۔ ان مسیحیوں سے برابر مسلمانوں کا ٹکراؤ ہوتا رہتا تھا۔

اسی نوعیت کی ایک جنگ ۱۰۸۶ء میں ہوئی۔ اس موقع پر پیش آنے والے واقعات میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ مسیحی حکمراں الاذفونش ششم (Alfonso VI) نے آغاز جنگ سے پہلے ایک خواب دیکھا۔ اس نے خواب میں دیکھا کہ وہ ایک ہاتھی پر سوار ہے، اس کے سامنے ایک طبل ہے جس کو وہ بجا رہا ہے۔ اس نے اپنا یہ خواب پادریوں سے بیان کیا۔ مگر وہ اس کی تعبیر نہ بتا سکے۔

اس کے بعد اس نے ایک مسلمان عالم کو بلایا جو خواب کی تعبیر جانتا تھا۔ مسیحی بادشاہ نے اس کے سامنے اپنا خواب بیان کیا۔ مسلمان نے تعبیر سے معذرت چاہی۔ مگر بادشاہ نے اصرار کیا۔ مسلمان نے سورہ الفیل اور سورہ المدثر (آیت ۸) کی روشنی میں اس کی تعبیر یہ بتائی کہ تم نے جو لشکر جمع کیا ہے وہ سب ہلاک ہوگا۔

مسیحی بادشاہ کے پاس اس وقت جو لشکر تھا اس کے فوجیوں کی تعداد پچاس ہزار تھی۔ بادشاہ جب اپنی فوج کے سامنے آیا اور اس کو دیکھا تو اس کے اندر اپنی قوت پر ناز پیدا ہوگیا۔ اس نے دوبارہ مذکورہ مسلمان عالم کو بلایا اور کہا کہ میرے اس لشکر کو دیکھو۔ اپنے اس عظیم لشکر کے ساتھ میں تمہارے پیغمبر کے لشکر سے لڑوں گا اور اس کو شکست دے کر رہوں گا۔ اس کے بعد روایت کے الفاظ یہ ہیں:

وقال لبعض المسلمین۔ ھذا الملك ھالك وکل من معه۔ وذکر قول رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم۔ ثلاث مھلکات (الحدیث) وفیه: واعجاب المرء بنفسه۔

مسلمان عالم نے کچھ مسلمانوں سے کہا کہ یہ بادشاہ ہلاک ہونے والا ہے اور اس کے سب ساتھی بھی۔ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ حدیث بیان کی جس میں ہے کہ تین چیزیں ہلاک کرنے والی ہیں۔ ان میں سے ایک ہے آدمی کا اپنے اوپر فخر کرنا۔

اس جنگ کی تفصیل عظمت اسلام (صفحہ ۹۲ - ۲۹۰) میں دیکھی جاسکتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ ذلاقہ کے مقام پر دونوں میں زبردست جنگ ہوئی۔ مسیحی فوج کی تعداد ۵۰ ہزار تھی اور مسلم فوج کی تعداد ۲۰ ہزار۔ مگر مسیحی فوج کو مکمل شکست ہوئی۔ مسیحی فوج میں سے صرف ۳۰۰ سوار بچ کر اپنے ملک کو واپس جا سکے اور مسلمانوں نے ان کا تمام مال، ہتھیار اور جانور وغیرہ غنیمت میں حاصل کیا (ولم یرجع من الفرنج الی بلادهم غیر ثلاث مائة فارس وغنم المسلمون کل مالهم من مال وسلاح ودواب وغیر ذلك) الکامل فی التاریخ، تالیف ابن اثیر، جلد ۱۰، صفحہ ۵۴-۱۵۱

انسان کی حیثیت یہ ہے کہ وہ خدا کا بندہ ہے، انسان کے لئے مناسب رویہ صرف تواضع کا رویہ ہے۔ فخر و ناز کا رویہ انسان کو زیب نہیں دیتا۔ اس دنیا میں وہی شخص کامیاب ہوتا ہے جو تواضع کی روش اختیار کرے۔ جو لوگ فخر و ناز کی روش اختیار کریں۔ وہ یقینی طور پر تباہ ہو کر رہ جائیں گے۔

تواضع کی روش آدمی کے اندر حقیقت پسندی پیدا کرتی ہے۔ وہ آدمی کو اس وہم سے بچاتی ہے کہ وہ اپنی طاقت کا غلط اندازہ کرکے بے جا اقدام کر بیٹھے اور پھر ہلاکت سے دوچار ہو۔ تواضع کی کیفیت جس آدمی کے اندر ہو وہ کبھی جذباتیت کا شکار نہیں ہوگا، بلکہ سنجیدگی اور تحمل کے ساتھ معاملات کو سمجھنے کی کوشش کرے گا۔ ایسا آدمی بے جا خود اعتمادی میں مبتلا نہیں ہوگا بلکہ لوگوں سے مشورہ کرکے صحیح رائے تک پہنچنے کی کوشش کرے گا۔

فخر و ناز کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ جو آدمی فخر و ناز کی نفسیات میں مبتلا ہوگا۔ اس کے اندر بے جا خود اعتمادی ہوگی۔ وہ اپنے بارہ میں غلط اندازہ کا شکار رہے گا۔ وہ کسی سے مشورہ لینے کی ضرورت نہیں سمجھے گا۔ وہ غیر ضروری طور پر لوگوں سے ٹکرائے گا اور اپنی غیر سنجیدہ حرکات سے لوگوں کو خواہ مخواہ اپنا دشمن بناتا رہے گا۔ جن لوگوں کے اندر اس قسم کے اوصاف ہوں ان کے لئے خدا کی اس دنیا میں ہلاکت کے سوا کوئی اور انجام نہیں۔

غلطی کہاں ہے

مولانا امین احسن اصلاحی (مقیم لاہور) کو ایک بار فرصت کے ساتھ علامہ اقبال کو پڑھنے کا موقع ملا۔ انھوں نے اقبال کا پورا اردو اور فارسی کلام از ابتدا تا انتہا نظر سے گزار لیا۔ اس مطالعہ کے نتیجہ کے طور پر طویل عرصہ تک ایک خاص کیفیت مولانا اصلاحی پر طاری رہی۔ وہ اپنے تاثرات کا اظہار بھی برملا اور واشگاف الفاظ میں کرتے رہے۔ چنانچہ ایک بار فرمایا: اقبال کا کلام پڑھنے کے بعد میرا دل بیٹھ سا گیا ہے کہ اگر ایسا حُدی خواں اس امت میں پیدا ہوا لیکن یہ امت ٹس سے مس نہ ہوئی تو ہماشما کے کرنے سے کیا ہوگا (ماہنامہ حکمت قرآن، لاہور، جولائی ۱۹۹۵، صفحہ ۱۷)

مولانا امین احسن کا یہ تبصرہ تاریخی طور پر درست نہیں ہے کہ اقبال کی حُدی خوانی سے مسلم قوم ٹس سے مس نہ ہوئی۔ اصل حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ قوم نہ صرف ٹس سے مس ہوئی بلکہ وہ حرکت وعمل کا سیلاب بن گئی۔ اس کے بحر کی موجوں میں طوفانی اضطراب کا سماں پیدا ہوگیا۔ اقبال کو خود اس کا احساس تھا۔ چنانچہ انھوں نے اپنے بارے میں کہا:

اقبال کا ترانہ بانگ درا ہے گویا ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا

اقبال کی "بانگ درا" سے کاروان ملت نہ صرف جادہ پیما ہوا بلکہ اس نے ایک عالم کو زیر وزبر کردیا

اقبال کے یہ الفاظ ان کے بارہ میں کسی مبالغہ کے بغیر درست ہیں:

جہانے را دگرگوں کرد یک مردِ خود آگاہے

واقعات کا تاریخی مطالعہ غیر مشتبہ طور پر اس کی صداقت کو ثابت کرتا ہے۔ یہاں میں اس سے تعلق رکھنے والے چند حوالوں کی طرف مختصر اشارے کروں گا۔

اس سلسلہ میں پہلی مثال پاکستان کی ہے۔ پاکستان کے نام پر برصغیر ہند میں جو دھواں دھار تحریک اٹھی وہ براہ راست طور پر اقبال کی دین تھی۔ یہ اقبال ہی کے افکار تھے جنھوں نے مسلمانانِ ہند کے اندر پاکستان کے حق میں جوش وخروش پیدا کیا۔

اقبال کے شارح حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اپنی کتاب "نقوش اقبال" کے دیباچہ

ہیں لکھتے ہیں کہ انھیں اسلام کے اس عظیم شاعر کی وفات سے چند ماہ پہلے ایک تفصیلی اور تاریخی ملاقات کا موقع ملا تھا۔ یہ ملاقات ۲۲ نومبر ۱۹۳۷ کو لاہور میں علامہ اقبال کے مکان پر ہوئی۔

حضرت مولانا علی میاں کے بیان کے مطابق، اقبال نے (پاکستان کے وجود میں آنے سے دس برس پہلے) پاکستان کے بارے میں فرمایا کہ جو قوم اپنا ملک نہیں رکھتی وہ اپنے مذہب اور تہذیب کو بھی برقرار نہیں رکھ سکتی۔ دین وتہذیب حکومت وشوکت ہی سے زندہ رہتی ہے۔ اس لئے پاکستان ہی مسلم مسائل کا واحد حل ہے، اور یہی اقتصادی مشکلات کا حل بھی ہے۔ (نقوش اقبال، لکھنؤ، ۱۹۸۵، صفحہ ۳۷)

اقبال کے تمام پرستار، خاص طور پر، پاکستان کے تمام علماء اور دانشور فخر کے ساتھ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اقبال پاکستان کے حقیقی بانی ہیں۔ مثال کے طور پر ماہنامہ حکمت قرآن (لاہور) کے مذکورہ شمارہ میں "مصور پاکستان" کے عنوان کے تحت ایک مضمون چھپا ہے جس میں پاکستان کے ایک مشہور بزرگ لکھتے ہیں:

"اقبال نے برصغیر ہند و پاک کی مسلمان قوم کے مستقبل کے بارے میں جو کچھ سوچا اور ان کے مسائل کا جو حل پیش کیا وہ ان کی بیدار مغزی اور معاملہ فہمی، بلکہ کہنا چاہئے کہ سیاسی تدبر کا شاہکار ہے۔ یہ صرف علامہ مرحوم ہی کی نگاہ دوررس ودوربیں تھی جس نے حالات کے رخ اور زمانہ کی رفتار کو پہچان کر (۱۹۳۰ میں) مسلمانان ہند کے جملہ مسائل کا حل اسے قرار دیا کہ ہندستان کے کم ازکم شمال مغربی گوشہ میں واقع مسلم اکثریت کے علاقوں پر مشتمل مسلمانوں کی ایک آزاد اور خود مختار مملکت قائم ہو جائے۔ پاکستان کے ساتھ علامہ اقبال کا تعلق صرف مصور کا نہیں، اس سے کہیں زیادہ ہے، انھوں نے موجود الوقت حالات میں مسلمانان ہند کے قومی مقدمہ کی پیروی کے لئے صحیح ترین وکیل کو ڈھونڈ نکالا۔ نہ صرف یہ کہ ان کی نگاہ دوررس نے مسلمانان ہند کی قیادت عظمیٰ کے لئے محمد علی جناح کو تاکا بلکہ خود ان میں اس حیثیت کا احساس اجاگر کیا۔ اس طرح علامہ اقبال نے نہ صرف یہ کہ پاکستان کا تصور پیش کیا بلکہ اس کے خاکہ میں رنگ بھرنے کی عملی جدوجہد کے ابتدائی مراحل میں بنفس نفیس شرکت بھی کی۔ اور گویا تحریک پاکستان کے کارکنوں کی فہرست میں شامل ہو گئے۔ اس اعتبار سے علامہ مرحوم کا ایک عظیم احسان ہر اس مسلمان کی گردن پر ہے جو پاکستان کی فضا میں ایک آزاد شہری کی حیثیت سے سانس لے رہا ہے" (صفحہ ۹-۱۰)

اقبال کے تمام معتقدین کا متفقہ طور پر یہ دعویٰ ہے کہ پاکستان کی تحریک میں جان ڈالنے والی شخصیت صرف علامہ اقبال کی تھی۔ اقبال کی "حدی خوانی" نے لوگوں کے اندر ایک "اسلامی وطن" حاصل کرنے کی سرشاری پیدا کی۔ یہاں تک کہ ۱۹۴۷ میں پاکستان کے نام سے ایک علیحدہ مملکت وجود میں آگئی۔ ایسی حالت میں کیسے کہا جاسکتا ہے کہ مسلمان اقبال کی حدی خوانی سے ٹس سے مس نہیں ہوئے۔

اس کے علاوہ بے شمار لوگ ہیں جو اقبال کے پرجوش کلام کو پڑھ کر "مجاہد" بن گئے۔ مثلاً کشمیر کے مسلمان ۱۹۸۹ سے بزعم خود جس خونی جہاد میں مشغول ہیں اس کی تحریک انھیں اقبال ہی کے کلام سے ملی ہے۔ بوسنیا کے لیڈر اور مجاہد عالیجاہ عزت بیگ نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ موجودہ انقلابی جدوجہد کا جذبہ ان کے اندر اقبال کے کلام کے انگریزی ترجمہ کو پڑھ کر ہی آیا تھا۔

افغانستان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہاں کے مجاہدین کو بھی اقبال کے فارسی کلام سے جنگ و جہاد کا حوصلہ ملا۔ وغیرہ وغیرہ۔

اس کے علاوہ اقبال کی رجز خوانی کے بالواسطہ اثرات کی فہرست بھی کم نہیں۔ مثلاً مولانا محمد علی جوہر جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انھوں نے پورے ہندستان کو ہلا دیا تھا، وہ بھی اقبال کے کلام سے متاثر تھے۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی جن کے متعلق ان کے معتقدین یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ انھوں نے اپنی کوشش سے ایک نیا عالمی عہد پیدا کر دیا، وہ بھی اپنے اقرار کے مطابق، اقبال کے کلام سے فیضیاب ہوئے تھے۔ پاکستان کے ڈاکٹر اسرار احمد صاحب آجکل عالمی خلافت کی ہنگامہ خیز تحریک چلا رہے ہیں وہ بھی بار بار یہ اعلان کرتے رہے ہیں کہ انھوں نے اقبال کے کلام سے غیر معمولی طور پر اثر قبول کیا ہے۔ وغیرہ۔

ان حقائق کی روشنی میں غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ مولانا امین احسن اصلاحی کا مذکورہ جملہ اصل واقعہ کی معکوس ترجمانی ہے۔ حقیقی صورت حال برعکس طور پر یہ ہے کہ اقبال کی حدی خوانی نے امت کو حرکت و عمل کا سمندر بنا دیا۔ ان کی حدی خوانی سے نئے ملک وجود میں آئے۔ سر دھڑ کی بازی لگانے والوں کی فوج کی فوج تیار ہو گئی۔ کتنے ممولے شہباز سے لڑ گئے۔ اور کتنے مرد مومن آتش نمرود میں کود پڑے۔ مزید یہ کہ ان کی اس انقلابی فیض رسانی کا سلسلہ آج تک بدستور مختلف صورتوں میں جاری ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اس واضح واقعہ کے باوجود مولانا امین احسن اصلاحی نے مذکورہ قسم کا برعکس تاثر کیوں ظاہر کیا۔ اس کی سادہ سی وجہ نتیجہ اور عمل کا فرق نہ سمجھنا ہے۔ واقعات بتاتے ہیں کہ اقبال کے کلام نے بھرپور طور پر مسلمانوں کو متحرک کیا اور ان کو عمل کے راستہ پر ڈالا۔ البتہ اس عمل کا مطلوب نتیجہ امت کو نہیں ملا۔ مولانا اصلاحی اور ان کے جیسے لوگوں کی غلطی یہ ہے کہ وہ نتیجہ کے فقدان کو عمل کا فقدان قرار دے رہے ہیں۔

نتیجہ کے فقدان کا مطلب یہ ہے کہ پاکستان کے نام سے اقبال کے خوابوں کا ملک بن گیا۔ مگر وہ ملت اسلام کی شوکت قائم کرنے میں ناکام رہا۔ مختلف ملکوں میں اقبال کے نوجوانوں نے شبری دکھائی۔ حتی کہ وہ بے خطر نمرود کی دہکائی ہوئی آگ میں کود پڑے۔ مگر ان کی موت امت کو زندگی دینے کا سبب نہیں بنی۔ اقبال کی ضرب کلیم اور بانگ درا سے ہمالیائی شخصیتیں اور آفاقی تحریکیں وجود میں آئیں مگر وہ ملت مسلمہ کی تباہی میں اضافہ کے سوا کوئی اور کارنامہ انجام نہ دے سکیں۔

معلوم ہوا کہ جو چیز مفقود ہے وہ نتیجۂ عمل ہے نہ کہ خود عمل۔ اقبال کے پرستاروں کو چونکہ مطلوب نتیجہ دکھائی نہیں دیتا، اس لئے وہ غیر شعوری طور پر یہ سمجھ لیتے ہیں کہ عمل بھی ظہور میں نہیں آیا۔ حالاں کہ جہاں تک عمل کا تعلق ہے وہ مسلسل طور پر جاری ہے۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ اقبال کی رہنمائی ہی درست نہ تھی۔ انھوں نے جس راستہ پر قوم کو دوڑایا وہ منزل کی طرف جانے والا راستہ ہی نہ تھا۔ اس لئے سو سال تک دوڑنے کے باوجود منزل بھی سامنے نہیں آئی۔

برصغیر ہند کے مسلمانوں کے مسائل کا حل جغرافیہ کی تقسیم نہ تھا بلکہ خود مسلمانوں کو تعلیم و ترقی کے راستہ میں آگے بڑھانا تھا۔ یہاں کے مسلمانوں کو شہباز و شاہین سے لڑانا نہ تھا بلکہ شہباز و شاہین کو دعوت حق کا مخاطب بنانا تھا۔ مسلمانان ہند کی ضرورت شاعرانہ حدی خوانی نہیں تھی بلکہ یہ تھی کہ سنجیدہ نثر میں ان کے فکر و شعور کو تربیت دے کر انھیں زمانۂ جدید کا شہری بنایا جائے۔ امت مسلمہ کے کرنے کا کام یہ نہ تھا کہ اپنے آپ کو الگ قوم اور دوسروں کو الگ قوم بتا کر علیحدہ جغرافی گوشہ میں سمٹ جائیں۔ بلکہ ان کے کرنے کا اصل کام یہ تھا کہ وہ ساری انسانیت کو ایک سمجھیں اور تمام قوموں کو ایک آفاقی تہذیب کے تحت لانے کی کوشش کریں۔

خلاصہ یہ کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کو حقیقت پسندی کی خوراک درکار تھی۔ مگر اقبال نے مسلمانوں کو جذباتی ہلچل اور رومانی پرواز کی خوراک دی۔ ایسی الٹی رہنمائی کا انجام وہی ہو سکتا تھا جو ہوا ــــ اقبال کا کیس غلط رہنمائی کا کیس ہے نہ کہ رہنمائی کو قبول نہ کرنے کا کیس۔

شیخ سعدی شیرازی کا ایک شعر اقبال اور ان کے کروروں متبعین پر پوری طرح صادق آتا ہے۔ سعدی نے ایک دیہاتی آدمی کو دیکھا کہ وہ زیارت کعبہ کے ارادہ سے سفر کر رہا ہے۔ مگر اس کا سفر الٹی سمت میں ہے۔ انھوں نے اس سے کہا کہ اے اعرابی، مجھے اندیشہ ہے کہ تم کعبہ تک نہ پہنچ سکو گے۔ کیوں کہ تم جس راستہ پر چل رہے ہو وہ راستہ برعکس رخ پر ترکستان کی طرف جا رہا ہے:

ترسم نہ رسی بہ کعبہ اے اعرابی　　کیں رہ کہ تو می روی بہ ترکستان است

یہی اقبال نے زیادہ بڑے پیمانے پر کیا۔ موجودہ زمانہ کی مسلم نسلوں کو تعلیمی جہاد کی ضرورت تھی مگر اقبال نے مسلمانوں کو سیاسی جہاد کا سبق دیا۔ مسلمانوں کے اندر سب سے پہلے فکری انقلاب لانا تھا۔ مگر اقبال نے مسلمانوں کو خارجی ہنگاموں میں ڈال دیا۔ مسلمانوں کو آج حقیقت پسندی کی خوراک درکار تھی مگر اقبال نے انھیں ہوائی اچھل کود میں مصروف کر دیا۔ مسلمانوں کو زمانہ سے ہم آہنگی کرتے ہوئے اپنی کامیابی کا منصوبہ بنانا تھا مگر اقبال نے سکھایا کہ زمانہ سے لڑ کر اس کے نظام کو توڑ پھوڑ ڈالو۔ مسلمانوں کو ہر اعتبار سے داخلی تیاری کی ضرورت تھی مگر اقبال نے اچانک مسلمانوں کو اقدام کے میدان میں دوڑا دیا۔ "گلوبل ویلیج" کے دور میں سارا عالم مسلمانوں کے لئے میدان عمل بن چکا تھا مگر اقبال نے مسلمانوں کو سبق دیا کہ تم ایک جغرافی گوشہ حاصل کر کے اس کے اندر محدود ہو جاؤ، وغیرہ۔

اقبال کے لفظی جوش وخروش نے مسلمانوں کے اندر زبردست ہلچل پیدا کی۔ مگر یہ ہلچل غلط سمت میں تھی، اور جو ہلچل غلط سمت میں ہو وہ لوگوں کو صحیح سمت میں لے جانے کا ذریعہ نہیں بن سکتی۔ اور نہ اس عالم اسباب میں اس کا کوئی نتیجہ برآمد ہو سکتا ہے۔

سب سے مشکل، سب سے آسان

"تم نے غلطی کی" اور "میں نے غلطی کی" ان دونوں جملوں میں ظاہر کے اعتبار سے صرف ایک لفظ کا فرق ہے۔ مگر حقیقت کے اعتبار سے دونوں میں اتنا زیادہ فرق ہے کہ پہلا جملہ کہنے والے کروروں انسان دنیا میں موجود ہیں، مگر دوسرا جملہ کہنے والا شاید کوئی ایک شخص بھی نہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلا جملہ دوسرے شخص کی نفی کرتا ہے اور دوسرا جملہ خود قائل کی نفی کرتا ہے۔ اور دوسرے کی نفی کرنا بلاشبہ سب سے زیادہ آسان کام ہے، اور اپنی نفی کرنا بلاشبہ سب سے زیادہ مشکل کام۔

موجودہ زمانہ کی وہ تمام تحریکیں جن کے گرد انسانوں کی بھیڑ دکھائی دیتی ہے، وہ سب وہی تحریکیں ہیں جو "تم نے غلطی کی" کے نعرہ پر اٹھیں۔ تمام مقبول تحریکوں اور تمام بڑے بڑے لیڈروں کی مقبولیت کا واحد راز یہ ہے کہ وہ باہر کے کسی شخص یا قوم کو غلط ثابت کرنے کے لئے اٹھے۔ اگر وہ خود اپنی نفی کرنے کا پیغام لے کر اٹھتے تو وہ اپنے ماحول میں اجنبی بن جاتے، نہ یہ کہ ان کے گرد انسانوں کی بھیڑ اکٹھا ہو۔

"تم نے غلطی کی" ایک جھوٹا کلمہ ہے، اور "میں نے غلطی کی" ایک سچا کلمہ۔ خدا کا قانون یہ ہے کہ اس دنیا میں جھوٹا کلمہ جڑ نہ پکڑ سکے، وہ جھاڑ جھنکاڑ بن کر رہ جائے۔ اس کے برعکس جو کلمہ سچا کلمہ ہو، وہ خدا کی اس دنیا میں جڑ پکڑتا ہے۔ وہ زمین میں بھی اپنی جگہ حاصل کرتا ہے اور آسمان کی وسعتوں میں بھی۔

"میں نے غلطی کی" معرفت کا کلمہ ہے۔ وہ آدمی کی شخصیت میں ارتقاء پیدا کرتا ہے۔ وہ آدمی کو ادنیٰ حالت سے اعلیٰ حالت کی طرف لے جاتا ہے۔ اس کے برعکس "تم نے غلطی کی" ایک سطحی کلمہ ہے۔ وہ آدمی کو گہرے معانی سے آشنا نہیں کرتا۔ وہ آدمی کو ایک ایسے کام میں مشغول کر دیتا ہے جو سرے سے کرنے کا کوئی کام ہی نہیں۔ "میں نے غلطی کی" اصلاح ہے اور "تم نے غلطی کی" تخریب۔ "میں نے غلطی کی" خدا پرستی ہے اور "تم نے غلطی کی" نفس پرستی۔ "میں نے غلطی کی" ایک نیکی ہے اور "تم نے غلطی کی" صرف لیڈری۔ "میں نے غلطی کی" دینداری ہے اور "تم نے غلطی کی" دنیا داری۔

بڑودہ کا سفر

بڑودہ میں ۱۲ - ۱۳ نومبر ۱۹۹۴ کو ایک آل انڈیا سمینار ہوا۔ اس سمینار کا موضوع تھا ریلیجن اینڈ پالٹکس۔ اس کی دعوت پر بڑودہ کا سفر ہوا۔

بڑودہ (موجودہ نام وڈودڑا) گجرات کا دوسرا بڑا شہر ہے۔ اس شہر کا قدیم ریکارڈ ۸۱۲ ع کی ایک دستاویز میں پایا جاتا ہے۔ یہ وہی سال ہے جب کہ اس وقت کے سب سے بڑے اسلامی شہر بغداد کو ایک بڑی فوج اپنے گھیرے میں لئے ہوئے تھی۔ یہ کسی دشمن کی فوج نہیں تھی۔ بلکہ المامون کی فوج تھی جو اپنے بھائی الامین کو عباسی تخت سے ہٹانے کے لئے اس کا محاصرہ کئے ہوئے تھا۔ تقریباً ایک سال کے محاصرہ کے بعد الامین کو قتل کر دیا گیا اور المامون عباسی سلطنت کا ساتواں خلیفہ بنا۔

بڑودہ کی آبادی پندرہ لاکھ ہے۔ اس میں تقریباً دس فیصد مسلمان ہیں۔ پچھلے ہزار سال کے دوران یہ شہر مختلف سلطنتوں کے ماتحت رہا۔ اس اعتبار سے اس کا نام بھی بار بار بدلتا رہا۔ چنانچہ تاریخ میں اس شہر کے حسب ذیل مختلف نام پائے جاتے ہیں:

Vadapadraka, Chandanavati, Varavati, Vatpatraka, Baroda, Vadodara.

دہلی سے ہوائی جہاز کا وقت صبح ۶ بجے تھا۔ ۱۲ نومبر کو فجر سے پہلے گھر سے روانگی ہوئی۔ سڑکوں پر اور چاروں طرف سیکڑوں کی تعداد میں بجلی کے چھوٹے چھوٹے بلب جلتے ہوئے نظر آئے۔ میں نے سوچا کہ اگر سورج نکل آئے تو اچانک یہ تمام بلب یا تو بجھا دئے جائیں گے یا اپنے آپ بے نور ہو جائیں گے ــــــ حقیقت اعلیٰ کا ظہور وحدت پیدا کرتا ہے اور تعدد کو ختم کر دیتا ہے۔ تعدد کے لئے یہی مقدر ہے کہ وہ ختم ہو جائے۔

فجر کی نماز ساڑھے پانچ بجے ایرپورٹ پر پڑھی۔ کچھ دیر کے بعد گیٹ کے اوپر لگے ہوئے شیشہ کے بورڈ پر جل اٹھا:

Now Boarding — 817

اس کا مطلب یہ تھا کہ اب، ہمارا جہاز تیار ہے۔ مسافر ایک ایک کر کے چل کر انڈین ایر لائنز کی فلائٹ

نمبر ۱۷۸ میں داخل ہوگئے۔

دہلی سے جہاز تقریباً وقت پر روانہ ہوا۔ آسمان کے کنارے شفق کی سرخی نظر آنے لگی۔ دھیرے دھیرے وہ غائب ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ روشن سورج افق پر نمایاں ہوگیا۔ حسب معمول میں کاغذ نکال کر کچھ تاثرات لکھنے لگا۔ میرے پاس بیٹھے ہوئے بزرگ نے کہا: آپ اردو لکھ رہے ہیں یا فارسی" میں نے پوچھا کیا آپ فارسی جانتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہاں۔ یہ مسٹر مکند دوبے (Muchkund Dubey) تھے۔ وہ فارین سروس سے ۱۹۶۹ میں ریٹائر ہوئے۔ اب وہ دہلی میں رہتے ہیں (Tel. 3718047)

انھوں نے بتایا کہ ملازمت کے زمانہ میں فارسی سیکھنے کے لئے انھیں ایران بھیجا گیا تھا۔ وہاں وہ ڈھائی سال رہے۔ انھوں نے اتنی کافی فارسی سیکھ لی کہ فارسی میں تقریر کرنے لگے۔ میں نے ان سے کہا کہ فارسی کا کوئی مقولہ جو آپ کو یاد ہو بتائیے۔ انھوں نے شیخ سعدی کا یہ مقولہ لکھ دیا: چگونہ شکر نعمت گزارم کہ مردم آزاری ندارم (خدا کی نعمت کا میں کس طرح شکر ادا کروں کہ میں لوگوں کو ستانے کی طاقت نہیں رکھتا)

ہماری پہلی منزل احمد آباد تھی۔ یہاں جہاز اترا تو میں باہر آگیا۔ احمد آباد کے مناظر دیر تک دیکھتا رہا۔ مجھے یاد آیا کہ پہلی بار میں ۱۹۷۱ میں احمد آباد آیا تھا۔ دہلی سے احمد آباد کا سفر میں نے ٹرین کے ذریعہ کیا تھا۔ واپسی ہوائی جہاز سے ہوئی۔ یہ ہوائی جہاز سے میرا پہلا سفر تھا۔ اس کے بعد سے اب تک میں ۱۰۰ سے زیادہ سفر ہوائی جہاز کے ذریعہ کرچکا ہوں۔ اور اگر آمد و رفت دونوں کو ملا کر شمار کیا جائے تو ۲۰۰ سے زیادہ۔

احمد آباد کا یہ سفر اگست ۱۹۷۱ میں ہوا تھا۔ الجمعیۃ ویکلی۔ ستمبر ۱۹۷۱ میں اس کی روداد شائع ہو چکی ہے۔ اس سفر نامہ کا ایک سبق آموز پیراگراف یہ تھا:

" یہاں میں ایک مسلم نوجوان سے ملا۔ وہ بزنس کرتے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ آپ نے اپنا کام کتنے سرمایہ سے شروع کیا۔ انھوں نے بتایا کہ دس روپیہ سے۔ میں نے دوبارہ پوچھا کہ اتنے کم سرمایہ سے کس طرح کام کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے پر اعتماد لہجہ میں جواب دیا: زبان سچی ہو اور ایمان دل میں ہو تو سرمایہ کی ضرورت نہیں۔ آپ زبان دے کر کتنا بھی سودا بازار سے اٹھا سکتے ہیں۔"

احمد آباد گجرات کا سب سے بڑا شہر ہے۔ سلطان احمد شاہ نے ۱۴۱۱ء میں اس کی بنیاد ڈالی تھی۔ اسی کے نام پر اس کو احمد آباد کہا جانے لگا۔ ۱۵۷۲ء میں مغل حکمراں اکبر نے اس پر قبضہ کرلیا۔ ۱۸۱۸ء میں وہ برطانیہ کے ماتحت آگیا۔ انگریزی دور میں یہاں پہلی کاٹن مل ۶۱-۱۸۵۹ء میں قائم کی گئی۔ احمد آباد اس وقت ہندستان کا پانچواں سب سے بڑا شہر ہے۔

راستہ میں مختلف اخبار دیکھے۔ ٹائمس آف انڈیا (۱۲ نومبر) کے ادارتی صفحہ کے اوپر حسب معمول ویلیس (W.R. Wallace) کا یہ قول نقل کیا گیا تھا کہ جو ہاتھ گہوارہ کو چلاتا ہے وہی وہ ہاتھ ہے جو دنیا پر حکومت کرتا ہے:

The hand that rocks the cradle
is the hand that rules the world.

یہی عورت کا اصل مقام ہے جو فطرت نے اس کو عطا کیا ہے۔ وہ اس نسل کو تیار کرتی ہے جو بالآخر باہر آکر دنیا کے تمام کاروبار کو سنبھالتی ہے۔ اس اعتبار سے عورت گویا معمار انسانیت ہے۔ مگر جدید تہذیب نے برابری کے مصنوعی اور غیر فطری تصور کے تحت عورت کو گھر کے اندر کے عظیم کردار سے محروم کر دیا۔ اور گھر کے باہر کا رول ادا کرنے کے قابل تو وہ تھی ہی نہیں۔

انگریزی اخبار دی ہندو (۱۲ نومبر) میں مسٹر اندرسین کے ایک آرٹیکل (ہندو ۲۲ اکتوبر) کی حمایت میں مسٹر وی کیبسوران (مدراس) کا خط چھپا تھا۔ انھوں نے کہا تھا کہ ہمارے کانسٹی ٹیوشن کے بنانے والوں نے یہ بہت بڑا بلنڈر کیا کہ انھوں نے بالغ رائے دہی (adult franchise) کے اصول کو دستور میں جگہ دی۔ ہمارے ملک کی اکثریت جاہل اور بے شعور ہے۔ ایسی حالت میں ہر بالغ آدمی کو ووٹ کا حق دینا گویا قوم کو ایسے لیڈروں کے حوالے کرنا ہے جو خوش نما نعروں کے ذریعہ انھیں بے وقوف بناتے رہیں۔

اس کے نتیجہ میں جو سیاسی کرپشن پیدا ہوا اس کی مثال دیتے ہوئے انھوں نے لکھا تھا کہ رومن ایڈمنسٹریٹر پبلی کولا (Publicola) جب مرا تو اس نے اتنی رقم بھی نہیں چھوڑی تھی جس سے اس کی آخری رسوم ادا کی جاسکیں۔ جب کہ ہمارے ملک کے حکمراں ایک بار حکومت میں آنے کے بعد اتنی دولت جمع کر لیتے ہیں جو ان کی کئی پشتوں کے عیش کے لئے کافی ہو۔

جہاز بڑودہ پہنچا تو یہاں سیمینار کے لوگ رہنمائی کے لئے موجود تھے۔ چوں کہ میرے ساتھ کوئی سامان نہیں تھا اس لئے ٹھہرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ ایر پورٹ سے مسٹر عظیم بندوق والا کے ساتھ روانگی ہوئی۔ وہ مسٹر جے ایس بندوق والا کے صاحبزادے ہیں اور کمپیوٹر انجینئرنگ کا کورس کر رہے ہیں۔ جب میں بڑودہ کی سڑکوں سے گزر رہا تھا تو یہاں کی ہر چیز مجھے دہلی کے مقابلہ میں پسماندہ نظر آئی۔ پھر میں نے سوچا کہ اسی طرح دہلی، یورپ اور امریکہ کے ترقی یافتہ شہروں کے مقابلہ میں پسماندہ محسوس ہوتا ہے۔ ذہن کا مسافر مزید آگے بڑھا تو خیال آیا کہ آدمی جب جنت کے شہر میں داخل ہوگا تو وہ پائے گا کہ پیرس اور واشنگٹن بھی مزید اضافہ کے ساتھ جنتی شہر کے مقابلہ میں انتہائی پس ماندہ تھے۔

ہماری گاڑی بڑودہ کی مختلف سڑکوں سے گزرتی رہی۔ یہاں تک کہ ہم لوگ اس علاقہ میں پہنچ گئے جس کو فرٹلائزر نگر کہا جاتا ہے۔ یہاں گجرات فرٹیلائزر کا وسیع گیسٹ ہاؤس ہے۔ میرے قیام کا انتظام اس کے اندر کیا گیا تھا (Shin Atami Guest House)۔ لیکن جب ہم لوگ وہاں پہنچے تو ریسپشن ڈسک پر کوئی موجود نہ تھا۔ صرف سیکورٹی گارڈ کا ایک آدمی پستول لٹکائے ہوئے گھوم رہا تھا۔ عظیم بندوق والا ڈھونڈنے کے لئے نکلے اور کچھ دیر میں ایک آدمی کو لے کر آئے۔ اس نے روم نمبر ۶ ہمارے لئے الاٹ کیا۔

ایک صاحب نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ سرکاری گیسٹ ہاؤس ہے اس لئے یہاں ایسا پیش آیا۔ اگر یہ پرائیویٹ ہوتا تو آپ دیکھتے کہ گیٹ میں داخل ہوتے ہی ایک شخص یہاں آپ کے استقبال کے لئے موجود ہے۔

ایک گفتگو کے دوران ایک "گاندھی بھگت" نے کہا کہ مہاتما گاندھی تو دیش کے بٹوارہ کے لئے آخر وقت تک راضی نہیں تھے۔ مگر نہرو اور دوسرے کانگرسی لیڈروں نے دیکھا کہ انگریز مسٹر جناح کے ذریعہ آزادی میں اڑنگا لگائے ہوئے ہے۔ وہ اس اڑنگے کو استعمال کرتا رہے گا اور کبھی ہم کو آزادی نہیں دے گا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم لوگ ایک ایک کر کے مر جائیں گے اور بھارت کو اپنے خوابوں کا دیش نہیں بنا سکیں گے۔ اس بنا پر نہرو وغیرہ نے بٹوارہ کو مان لیا تاکہ انگریزوں کے سیاسی قبضہ سے چھٹکارا حاصل کر کے دیش کی تعمیر کی جا سکے۔

نہرو کا خواب کیا تھا۔ وہ پہلے ہی انھوں نے اپنی آپ بیتی میں لکھ دیا تھا کہ میں انڈیا کو ایک سوشلسٹ انڈیا دیکھنا چاہتا ہوں۔ ان کی سوچ یہ تھی کہ اقتدار پر قبضہ کرکے ہم بڑے پیمانہ پر پبلک سکٹر بنائیں گے اور ہر شعبہ میں ایسے معیاری ادارے قائم کریں گے جو پرائیوٹ سکٹر کے لئے بطور نمونہ کام دے گا۔ چنانچہ نیشنل گورنمنٹ قائم ہونے کے بعد نہرو اور ان کے ساتھیوں نے ملک کی دولت کا بڑا حصہ پبلک سکٹر قائم کرنے میں جھونک دیا۔ مگر چالیس سالہ تجربہ کے بعد معلوم ہوا کہ نام نہاد پبلک سکٹر صرف کرپشن کا ذریعہ ہے۔ مزید یہ کہ اس نے پوری قوم کو کاہل (lethargic) بنا کر رکھ دیا۔

اس طرح نہرو کی قیادت نے ملک کو دہرا نقصان پہنچایا ہے۔ اس نے مسٹر جناح کے "اڑنگے" کو غیر ضروری اہمیت دی جس کے نتیجہ میں ملک کے ٹکڑے ہو گئے۔ اور دوسری طرف حاصل شدہ ہندستان کو اقتصادی تباہی کی خندق میں گرا دیا۔ نہرو کو ہندستان سے بے پناہ محبت تھی جس کا اندازہ ان کے وصیت نامہ سے ہوتا ہے۔ لیکن اگر سوچ درست نہ ہو تو محبت بھی الٹا نتیجہ پیدا کرنے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

ٹھیک یہی معاملہ مسلم ملکوں میں بھی پیش آیا۔ مسلم ملکوں کے اسلام پسند مخلصین نے اپنی فکری غلطی کے تحت ہر جگہ سیاسی چھلانگ لگائی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دور جدید میں اسلامی دعوت کے تمام امکانات برباد ہو کر رہ گئے۔

گیسٹ ہاؤس کے کمرہ میں پہنچ کر میں نے پہلا کام یہ کیا کہ دیواروں کے پردے ہٹا دئے۔ اس طرح کے کمروں میں عام طور پر باہر کی طرف قدرتی مناظر ہوتے ہیں۔ مگر جدید تہذیبی رواج کے مطابق، اس پر لمبا پردہ پڑا رہتا ہے۔ مجھے ایسا پردہ پسند نہیں۔ پردہ کو ہٹانے کے بعد لمبے شیشہ کے اُس پار فطرت کے ہرے بھرے مناظر دکھائی دینے لگے۔ اس کے بعد کچھ دیر تک مسٹر بندوق والا سے گفت گو ہوئی۔

مسٹر عظیم بندوق والا گویا مسلمانوں کی "کمپیوٹر جنریشن" کے نمائندہ ہیں۔ انھوں نے صفائی کے ساتھ کہا کہ میرے گھر کے لوگ اگرچہ روایتی طور پر مذہبی رہے ہیں۔ مگر میں تو ایک ملحد (atheist) ہوں۔ میں مذہب میں اعتقاد نہیں رکھتا:

I don't believe in religion.

سوالات کے دوران اندازہ ہوا کہ اس الحاد کے پیچھے کوئی گہرا شعور یا کوئی سوچا سمجھا فکر نہیں ہے۔ بس آزادی اس کا سبب ہے۔ ایسے نوجوانوں کو اینٹی مذہب سے زیادہ اینٹی اتھارٹی (anti authority) کہا جا سکتا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ ہماری نسل کے لوگ جب مل کر بیٹھتے ہیں تو وہ مذہب یا پالی ٹکس کی بات نہیں کرتے۔ ان کی بات چیت کا موضوع فلم، کھیل، وغیرہ ہوتا ہے۔

میں نے کہا کہ آپ لوگ اپنے کو لامذہب نہ کہئے بلکہ آزادی پسند کہئے۔ کیوں کہ آپ لوگوں کی لامذہبیت کے پیچھے کوئی عقلی یا سائنٹفک دلیل نہیں ہے۔

یہاں انڈین ایکسپریس کا بڑودہ اڈیشن (۱۲ نومبر ۱۹۹۴) دیکھا۔ اس میں لیٹرس کے کالم میں احمد آباد کے مسٹر سدھیر ترویدی کا خط تھا۔ انھوں نے ایک صاحب کا قول نقل کرتے ہوئے لکھا تھا کہ سردار پٹیل کو انڈیا کا لوہ پرش (Iron Man) کہا جاتا ہے۔ مگر زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ ان کو سنہہ پرش (Lion man) کہا جائے۔ یعنی شیر ہند۔ اسی طرح کچھ لوگوں نے سرفضل الحق کو شیر بنگال کہا۔ کچھ لوگوں نے شیخ عبد اللہ کو شیر کشمیر کا لقب دیا۔ وغیرہ۔ مگر شیروں کی اس کثرت کے باوجود ہمارے ملک کا کوئی مسئلہ حل نہ ہو سکا۔ میں سمجھتا ہوں کہ آزادی کے بعد ہمیں دھاڑنے والے شیروں کی ضرورت نہیں تھی بلکہ ایسے خاموش انسانوں کی ضرورت تھی جو تدبیر اور حکمت کے ساتھ ملک کو ترقی کی طرف لے جانے کا منصوبہ بنائیں۔

۱۲ نومبر کو دوپہر سے پہلے میں بڑودہ پہنچ چکا تھا۔ ایک بجے گیسٹ ہاؤس کا آدمی آیا۔ اس نے کہا کہ کھانا تیار ہے۔ میں کمرہ سے نکلا تو دروازہ کا تالا بند کرنے کے لئے چابی موجود نہیں تھی۔ میں نے آدمی سے کہا کہ " چابی تو تم نے دی نہیں "۔ اس نے جواب دیا : " چابی کا ضرورت نہیں صاحب "۔ چنانچہ میں دروازہ مقفل کئے بغیر نیچے اتر گیا۔

کھانے کی میز پر میں اور پروفیسر رشید الدین صاحب (جامعہ ہمدرد) تھے۔ جو آدمی کھانا رکھ رہا تھا، اس سے میں نے نام پوچھا۔ اس نے کہا " عبدل بھائی " میں نے کہا کہ یہ تو اصل نام معلوم نہیں ہوتا۔ اس نے کہا کہ میرا اصل نام عبد الغنی ہے۔ یہاں لوگ مجھ کو عبدل بھائی کے نام سے پکارتے ہیں۔

پروفیسر رشید الدین ایک ذی علم اور تجربہ کار آدمی ہیں۔ انھوں نے اپنی زندگی کے بہت سے قصے سنائے۔ انھوں نے بتایا کہ ۳۰ اکتوبر ۱۹۹۴ کو کانپور میں علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کی طرف سے ایک جلسہ تھا۔ اس جلسہ کے صدر جن ستا کے اڈیٹر مسٹر پربھاش جوشی تھے۔ اور پروفیسر رشید الدین اس میں مقرر کی حیثیت سے بلائے گئے تھے۔ انھوں نے اپنی تقریر میں اسلام کا تعارف کرتے ہوئے بتایا کہ اسلام کی بنیاد چار چیزوں پر ہے ——— علم، عقل، عدل، رحیمیت (compassion)۔ پربھاش جوشی جو پہلے سے پروفیسر رشید الدین کو جانتے تھے، انھوں نے آخر میں اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ مجھے اگر پروفیسر رشید الدین جیسے ۱۰۱ مسلمان مل جائیں تو میں اسلام قبول کرنے کے لئے تیار ہوں۔

پروفیسر رشید الدین نے الرسالہ مشن کی تائید کرتے ہوئے کہا کہ یہ بہت ضروری ہے کہ لوگوں کا دل جیتا جائے۔ آج ہمیں کنفرنٹیشن کی نہیں بلکہ پرسویشن (Persuasion) کی ضرورت ہے۔

۱۲ نومبر کی شام کو میں اپنے کمرہ کا پچھلا دروازہ کھول کر باہر آیا۔ یہ دروازہ ایک پارک کی طرف کھلتا تھا۔ دور تک پھول اور درخت اور ہریالی کا منظر تھا۔ میں نے سوچا کہ پارک اس گیسٹ ہاؤس کی عمارت کی رونق ہے۔ عمارت کے ساتھ اگر یہ "باغ" نہ ہو تو گیسٹ ہاؤس بالکل سونا دکھائی دینے لگے۔

یہ سوچتے ہوئے قرآن کی آیت یاد آئی: ومساکن طیبۃ فی جنات عدن۔ ان الفاظ میں قرآن نے جنت کی منظر کشی کی ہے۔ یعنی جنت میں پاکیزہ مکانات ابدی باغوں میں ہوں گے۔ ایک عمدہ مکان کے بارہ میں انسان کا تصور یہی ہے کہ وہ باغ کے درمیان ہو۔ انسانی تخیل آج بھی اس سے آگے نہ جا سکا۔ قرآن یا اسلام کی صداقت کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ اس کی ہر بات اپنے آخری معیار پر ہے۔ کوئی فلسفی یا کوئی آرٹسٹ کسی بھی چیز میں قرآن کے معیار سے آگے کا معیار پیش کرنے پر قادر نہیں۔

۱۲ نومبر کی شام کو کھانے کا اجتماعی نظام جیوتی گیسٹ ہاؤس میں تھا۔ مغرب کی نماز سے فراغت کے بعد پروفیسر رشید الدین، پروفیسر امریک سنگھ اور میں کار میں بیٹھ کر روانہ ہوئے۔ یہ

تقریباً آدھ گھنٹہ کا راستہ تھا۔ راستہ میں دونوں صاحبان بات کرتے رہے۔ میں زیادہ تر ان کی باتیں سنتا رہا۔

پروفیسر امریک سنگھ نے کہا کہ گری لال جین (سابق اڈیٹر ٹائمس آف انڈیا) سے میری بہت باتیں ہوتی تھیں۔ وہ ہمیشہ اسلام کی مخالفت کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اسلام صرف اپنے کو برحق بتاتا ہے، باقی جتنے مذہب ہیں سب اس کے نزدیک کمتر یا غلط ہیں۔ پروفیسر امریک سنگھ نے ان کو جواب دیا کہ تم یہ نہ دیکھو کہ کتابوں میں کیا لکھا ہوا ہے۔ اصل یہ ہے کہ تمام آدمی سماجی دباؤ (social compulsion) کے تحت کام کرتے ہیں۔ مسلمان اس عام اصول سے مستثنیٰ نہیں۔ سماجی دباؤ مسلمانوں کو اپنے آپ معتدل بنا دیتا ہے۔

پروفیسر رشید الدین نے کہا کہ یہ صرف اسلام یا مسلمانوں کی بات نہیں۔ جب بھی آدمی کسی راستہ کو اختیار کرتا ہے تو اس کو یہی سمجھنا پڑتا ہے کہ یہی واحد راستہ ہے:

It is the only right path.

آدمی کو جب تک اپنے مذہب پر یقین نہ ہو وہ اس کو پوری طرح اختیار نہیں کر سکتا۔ اس لئے لوگوں کو اپنے اپنے یقین پر رہنے دیجئے۔ البتہ ان کو یہ بتائیے کہ اپنے مذہب پر یقین رکھتے ہوئے تم دوسرے مذہب والوں کا احترام کرو۔

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ہماری گاڑی جیوتی گیسٹ ہاؤس میں داخل ہو گئی۔ یہ شہری ماحول کے درمیان گویا ایک نخلستان تھا۔ یہاں خوبصورت لان میں لوگ کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر باتیں ہوتی رہیں۔ اس کے بعد لوگوں نے کھانا کھایا۔ یہاں تمام لوگ صرف انگریزی زبان استعمال کر رہے تھے۔ یہاں ہر چیز "انگلش" معیار پر نظر آئی۔

میں نے سوچا کہ ہندستان دو ہندستان ہے۔ ایک وہ ہندستان جس میں اس ملک کے ۹۵ فیصد لوگ رہتے ہیں۔ دوسرا وہ جس میں صرف پانچ فیصد لوگ آباد ہیں۔ مہاتما گاندھی نے کہا تھا کہ میرا مشن ہر آنکھ کے آنسو پوچھنا ہے۔ مگر آزادی کے بعد جو ہندستان بنا وہ عملاً اس کے برعکس تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ خواہ ہندستان ہو یا اور کوئی ملک، محض سیاسی حکمرانوں کی تبدیلی سے سماجی حالات نہیں بدل سکتے۔

کھانے کے بعد ہم لوگ اپنی قیام گاہ پر آ گئے۔ خلاف معمول آج مجھے دیر میں نیند آئی۔ میری حالت اس انسان کی سی تھی جو نہ مروجہ ماحول میں خوش رہ سکے۔ اور نہ وہ دوسرا ماحول اپنے موافق بنانے پر قادر ہو۔

سمینار میں شریک ہونے والے لوگوں سے، نیز شہر کے اہل علم سے مختلف اوقات میں ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ ان سے جو باتیں ہوئیں ان میں سے کچھ مختصر طور پر یہ ہیں۔

ایک ہندو پروفیسر نے کہا کہ جین دھرم کے بانی مہاویر ڈھائی ہزار سال پہلے پیدا ہوئے۔ ان کا گرنتھ بہت دنوں تک زبانی طور پر چلتا رہا۔ صرف ایک ہزار سال پہلے اس کو لکھا گیا۔ ہندوؤں کے وید اور بھی ہزاروں سال پہلے سے ہیں۔ مگر وہ بھی صرف پہلی صدی عیسوی میں لکھے گئے۔ ایسی حالت میں کیسے یقین کیا جا سکتا ہے کہ جین دھرم اور ہندو دھرم کے جو گرنتھ پستکوں کی صورت میں ہمارے پاس ہیں وہ ٹھیک وہی ہیں جیسا کہ وہ شروع میں تھے۔ زبانی روایت میں ہمیشہ بات بدل جاتی ہے۔ اس لئے ان گرنتھوں میں بھی ضرور تبدیلی آئی ہوگی۔ پھر انھوں نے کہا کہ قرآن میں بھی ضرور ایسا ہی ہوا ہوگا۔ آج جو قرآن ہے وہ وہی نہیں ہو سکتا جو پیغمبر صاحب کے زمانہ میں تھا۔

میں نے کہا کہ دوسرے مذہب کے گرنتھوں کے بارہ میں آپ کی بات درست ہے۔ مگر قرآن کے بارہ میں تاریخی طور پر یہ بات درست نہیں۔ کیوں کہ قرآن جب اترتا تھا اسی وقت وہ لکھ بھی لیا جاتا تھا۔ دوسرے مذہبی گرنتھوں کے برعکس، قرآن وہ استثنائی کتاب ہے جس میں تلاوت اور تحریر دونوں اول دن سے ساتھ ساتھ چل رہی ہے۔ اس لئے قرآن میں تبدیلی کا کوئی سوال نہیں۔

ایک تعلیم یافتہ مسلمان نے کہا کہ ہم دنیا میں ایک بلین سے زیادہ ہیں۔ اگر سب مل کر کام کریں تو ہم بہت بڑی طاقت بن سکتے ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے چند تجویزیں پیش کیں ——— مسلم ممالک اپنے درمیان کامن ڈیفنس کا ایک نظام بنائیں۔ مسلمان اپنی ایک عالمی نیوز ایجنسی قائم کریں۔ مسلم ملکوں کی ایک یونائیٹڈ آرگنائزیشن ہو۔ مسلم ملکوں کا ایک سنٹرل بینک بنایا جائے۔ مسلم ملکوں کا ایک کامن مارکٹ قائم کیا جائے۔ اس قسم کی کچھ بڑی بڑی تجویزیں پیش کرنے کے بعد انھوں نے کہا:

A beginning has to be made. Let us make a beginning.

میں نے کہا کہ یہ آغاز نہیں ہے۔ آپ اختتام سے آغاز کرنا چاہتے ہیں۔ حالاں کہ آغاز تو ہمیشہ ابتدا سے ہوتا ہے۔ اس وقت مسلمانوں کے لئے ایک ہی نقطۂ آغاز ہے، اور وہ تعلیم ہے۔ ہمارے درمیان جب تک تعلیم عام نہ ہو جائے، کوئی بھی بڑا کام نہیں کیا جا سکتا۔

ایک تعلیم یافتہ مسلمان سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ آپ ہمیشہ صبر و اعراض کی بات کرتے ہیں۔ یہ تو مسلمانوں کی غیرتِ ملّی کے خلاف ہے۔ میں نے کہا کہ یہ غیرتِ ملّی کا مسئلہ نہیں، بلکہ یہ حیثیتِ ملّی کا مسئلہ ہے۔

مسلمان عام معنوں میں کوئی قوم نہیں ہیں۔ وہ پیغمبر آخر الزماں کی امت ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ختم نبوت کے بعد مسلمان مقام نبوت پر ہیں۔ ان کو دعوت کا وہ کام انجام دینا ہے جس کے لئے پیغمبر آیا کرتے تھے۔ مسلمان اور دوسری قوموں کے درمیان داعی اور مدعو کا تعلق ہے نہ کہ ایک قوم اور دوسری قوم کا۔

مسلمان کی یہی حیثیت اس کے اوپر لازم کر دیتی ہے کہ وہ اپنی مدعو قوموں کی زیادتیوں پر صبر کرے۔ اس ملک میں مسلمان پندرہ فیصد ہیں اور غیر مسلم پچاسی فیصد۔ ایسی حالت میں لازماً ایسا ہوگا کہ دوسروں کی طرف سے مسلمانوں کو ناخوشگواری یا زیادتی کا تجربہ ہوگا۔ اس ناخوشگواری یا زیادتی کے مقابلہ میں انھیں ادفع بالتی ہی احسن کے قرآنی اصول پر عمل کرنا ہے۔ اگر مسلمان ایسا نہ کریں تو اس کے بعد ان کا امت محمدی ہونا خدا کی نظر میں غیر متحقق ہو جائے گا۔ جو ماں اپنے بچہ کی باتوں کو برداشت نہ کرے وہ ماں ہی نہیں۔

ایک طالب علم نے کہا کہ آج کا نوجوان پیچھے کی طرف نہیں دیکھتا۔ وہ صرف آگے کے بارہ میں سوچتا ہے۔ میں نے پوچھا کہ یہ بتائیے کہ ہمارے کتنے نوجوان ایسے ہیں جو سائنٹفک ریسرچ میں دل چسپی رکھتے ہوں۔ انھوں نے کہا کہ مجھے تو آج تک کوئی اسٹوڈنٹ ایسا نہیں ملا جو یہ کہے کہ میں اپنی زندگی سائنسی ریسرچ کے لئے وقف کر دوں:

My intention is to devout my life in scientific research.

میں نے کہا کہ پھر آپ کو یہ کہنا چاہئے کہ آج کا نوجوان صرف پیسہ یا کیریر کے بارہ میں سوچتا ہے۔ یہ آگے کی طرف سوچنا نہیں ہے۔ آگے کی طرف سوچنا یہ ہے کہ ہمارے نوجوانوں میں ریسرچ کا شوق ہو۔

۔ وہ نئی نئی چیزیں دریافت کرنا چاہتے ہوں۔ وہ دنیا کو کوئی نیا سائنسی تحفہ دینے کا حوصلہ رکھیں۔

۱۲ نومبر کی صبح کو ہم لوگ اپنی قیام گاہ سے وانیجیا بھون (ریس کورس سرکل) لے جائے گئے یہاں کے ہال میں ساڑھے نو بجے سیمنار کا پہلا سشن شروع ہو رہا تھا۔ اس کے چیئر پرسن پروفیسر رشید الدین خاں تھے۔ اس کا موضوع تھا۔ کیا پالیٹکس اور مذہب کو الگ کیا جاسکتا ہے:

Can politics and religion be separated?

انیس آدمیوں نے اس بحث میں حصہ لیا۔ ایک صاحب نے کہا کہ سیمنار گویا ذہنوں کا اختلاط (interaction of minds) ہے۔ تاہم میرا تجربہ ہے کہ یہ اختلاط تو ہے مگر وہ اتحاد نہیں۔ تعلیم یافتہ طبقہ کا ہر فرد خود پسند (egoist) ہوتا ہے۔ اس لئے تعلیم یافتہ لوگوں کو کسی ایک نقطۂ نظر پر متفق کرنا انتہائی مشکل ہے۔ اس سیمنار میں ہر آدمی نے کوئی ایک پہلو لے کر اس پر ایک خوبصورت تقریر کر ڈالی۔ چند باتیں بطور مثال یہاں نقل کی جاتی ہیں:

ایک صاحب نے کہا کہ اجودھیا میں رام رحیم ٹرسٹ قائم کیا جائے۔ ایک صاحب نے کہا کہ انڈیا کے تمام مسائل کی جڑ جہالت اور ناخواندگی ہے۔ کسی نے کہا کہ تمام مسائل کی جڑ اقتصادی پسماندگی ہے۔ کسی نے مذہب کو، کسی نے پولیٹیکل کرپشن کو، کسی نے پارٹیشن کو، کسی نے سیکولر کانسٹی ٹیوشن کو ساری خرابیوں کا ذمہ دار بتایا۔

میں نے کہا کہ مہاتما گاندھی نے کہا تھا کہ جس دن مذہب کو سیاست سے الگ کر دیا جائے گا اس دن انڈیا تباہ ہو جائے گا، دوسری طرف بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ مذہب کو سیاست سے ملانے ہی کی وجہ سے انڈیا تباہ ہوا ہے، اس لئے دونوں کو الگ کر دینا ضروری ہے۔ اس اختلاف کا سبب یہ ہے کہ مہاتما گاندھی نے مذہب کو اس کے اصل پہلو کے لحاظ سے لیا تھا اور آجکل کے لوگ مذہب کو سیاسی استحصال کے لئے لے رہے ہیں۔

ایک صاحب کی بات کے جواب میں میں نے کہا کہ سیاست وہی ہے جو حالات کے اعتبار سے قابل عمل ہو۔ موجودہ حالات میں مذہبی سیاست قابل عمل نہیں۔ کیوں کہ اس کے موافق ذہنی فضا ملک میں موجود نہیں۔ اس وقت ہم جن حالات کے درمیان ہیں اس میں قابل عمل سیاست صرف ایک ہے، اور وہ سیکولر سیاست ہے۔

۱۳ نومبر کی سہ پہر کو دوسرا سشن تھا۔ اس کا موضوع تھا : ہیومن رائٹس اینڈ ریلیجن۔ اس سشن میں مجھ کو لیڈ اسپیکر بنایا گیا تھا۔ جب کارروائی شروع ہوئی اور میرے بولنے کا وقت آیا۔ تو میرے پاس بیٹھے ہوئے پروفیسر گوہن نے کہا کہ صبح کے سشن میں آپ نے "ہندی" میں تقریر کی۔ میرا تعلق کیرالا سے ہے اور میں ہندی بالکل نہیں جانتا۔ اس لئے آپ انگریزی میں بولیں تاکہ میں بھی سمجھوں :

Dr. S. Guhan, Institute of Development Studies
79, Second Main Road, Gandhi Nagar,
Adyar, Madras 600 020 (Tel. 4914191)

میں نے پہلے سے انگریزی میں بولنے کی تیاری نہیں کی تھی۔ مگر ڈاکٹر گوہن کے کہنے پر میں نے یہ فیصلہ کیا کہ مجھے انگریزی ہی میں بولنا ہے۔ چنانچہ میں نے دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ سے دعا کی۔ اس کے بعد تقریر شروع کی۔ خدا کے فضل سے دیر تک نہایت کانفیڈنس کے ساتھ انگریزی میں بولتا رہا۔ ڈاکٹر گوہن بہت خوش ہوئے۔ حتی کہ انھوں نے اسلام کے مطالعہ کی خواہش ظاہر کی۔ میں نے کہا کہ انشاءاللہ آپ کو انگریزی لٹریچر بھیجنے کی کوشش کی جائے گی۔

میں نے ۹ نومبر کے ٹائمس آف انڈیا کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ اس میں مسٹر روسی مودی (Russi Mody) کا ایک بیان چھپا ہے۔ وہ ایرانڈیا اور انڈین ایرلائنز کے مشترک چیرمین مقرر کئے گئے ہیں۔ ان سے پوچھا گیا کہ آپ دونوں ہوائی کمپنیوں کے بڑھے ہوئے مسائل کو کس طرح حل

1. Soli Sorabjee, New Delhi
2. Madhu Mehta, Bombay
3. Maulana Wahiduddin Khan, New Delhi
4. Dharma Kumar, New Delhi
5. Veenaben, New Delhi
6. Kaokab Durry, New Delhi
7. Rasheeduddin Khan, New Delhi
8. Nirmal Verma, New Delhi
9. Satish Chandra, New Delhi
10. Amrik Singh, New Delhi
11. Nagindas Sanghavi, Bombay
12. Arvind Deshpande, Bombay
13. Nikhil Wagle, Bombay
14. Teesta Setalvad, Bombay
15. S. Guhan, Madras
16. M.N. Srinivas, Bangalore
17. Sofia Khan, Ahmedabad
18. Narayan Sheth, Ahmedabad
19. Manubhai Pancholi, Ahmedabad
20. Vishnu Pandya, Ahmedabad
21. Hasanali Firashta, Surat
22. Joseph Mecwan, Anand
23. Chunibhair Patel, Baroda
24. V.N. Kothari, Baroda
25. Tulsi Boda, Baroda
26. Bhaskar Vyas, Baroda
27. I.G. Patel, Baroda
28. Nanubhai Amin, Baroda
29. G.N. Devy, Baroda
30. Alaknanda Patel, Baroda
31. J.S. Bandukwala, Baroda
32. Sanjeev Shah, Baroda

کریں گے ، خاص طور پر پائلٹوں کے مسائل جو آئے دن اسٹرائک کرکے سارا نظام درہم برہم کرتے رہتے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ میں یونین کے پاس صنعتی تعلقات پر لکھی ہوئی بہترین کتاب کے ساتھ جاؤں گا۔ یہ بائبل ہے۔ اس کے مشہور دس احکام میں سے دو یہ ہیں کہ دوسروں کے ساتھ وہی کرو جو تم اپنے لئے چاہتے ہو ، اور اپنے پڑوسی سے اسی طرح محبت کرو جیسی محبت تم اپنے لئے پسند کرتے ہو :

Iwill go to the unions by the best book on industrial relation ever written — The Bible. As two of the ten commandments say: do unto others as you would do unto yourself, and love your neighbour as you would love yourself.

میں نے کہا کہ یہ دونوں حکم تمام مذہبوں میں پائے جاتے ہیں اور یہ بلاشبہ سماجی اخلاقیات کی بنیاد ہیں۔ اگر یہ اخلاقی اصول لوگوں کی زندگیوں میں آجائے تو تمام سماجی جھگڑے اپنے آپ ختم ہو جائیں۔

میرا مقالہ اور میری یہ تقریر دونوں ہی سمینار کے منتظمین نے اپنی رپورٹ کے ساتھ شائع کردی ہیں۔ ان کا پتہ یہ ہے :

12 Amee Society
Old Padra Road
Baroda 390015

مسٹر الکنندا پٹیل (Alaknanda Patel) مسلم صوفیوں سے متاثر ہیں۔ انھوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ پیغمبر اسلام کے بارہ میں بتایا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنے فلسفہ کا خلاصہ ایک لفظ "اخلاق" میں بتایا تھا۔ اور راما کرشنا دیو نے دھرم کا خلاصہ ایک لفظ میں مہربانی بتایا :

The Prophet of Islam is supposed to have summarised his philosophy with one word, 'Akhlaq', - sincerity, and Ramakrishnadev with the word 'compassion'.

نئی دہلی کی وینا بہن (Tel. 4620066) نے یونیفارم سول کوڈ کے بارہ میں کہا کہ مسلمانوں کے اوپر جبراً ایک سول کوڈ لاگو کرنا اس وقت الٹا نتیجہ پیدا کرے گا۔ ان کو یہ موقع دینا چاہئے کہ وہ آزادانہ طور پر خواہ یونیفارم سول کوڈ کے تحت اپنے نکاح کو رجسٹر کروائیں یا مسلم پرسنل لا کے تحت :

Imposing a civil code on Muslims will produce a negative result at this moment. An option should be thrown open and they should be free to get their marriages registered under either uniform civil code or Muslim personal law.

مسٹر مدھو مہتا نے کہا کہ پالی ٹکس آج کریمنل لوگوں کے ہاتھ میں ہے۔ اور وہ پولیس کو اپنے مجرمانہ منصوبوں کے لئے ٹولی کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ الٰہ آباد ہائی کورٹ کے ایک جج کو یہ کہنا پڑا کہ مجھ کو پولیس سے بچاؤ۔ اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے سپریم کورٹ آف انڈیا کے سابق چیف جسٹس مسٹر وینکٹ چلیا (Mr. Venkatachelliah) نے کہا تھا کہ یہ (رول آف لا) کے خاتمہ کا آغاز ہے:

This is the beginning of the end.

بروڈہ یونیورسٹی میں اکنامکس ڈپارٹمنٹ کے پروفیسر وی این کوٹھاری نے کہا کہ ہندستان کی مسلم کمیونٹی ایک ایسے مسئلہ سے دوچار ہے جو شاید کسی بھی دوسرے ملک کی مسلم کمیونٹی کو درپیش نہیں۔ ماضی میں وہ اس ملک میں ایک حکمراں اقلیت کی حیثیت رکھتی تھی۔ آج وہ ایک ایسی اقلیت ہے جس کو حاکمانہ حیثیت حاصل نہیں۔ مسلم جماعتیں عام طور پر اقتدار کی حیثیت میں رہی ہیں۔ ہندستان میں اس نے یہ حیثیت کھو دی ہے۔ اب اس غیر حاکمانہ حیثیت کو تسلیم کرنا ان کے لئے مشکل ہو رہا ہے:

The Islamic community in India faces a problem which perhaps Islamic community in no other country faces. It has been in the past a minority community in a ruling position in India. Today it is a minority community without that status. Islamic communities have been either in majority or if in minority, generally in ruling position. In India today, it is in a minority without the status of a ruling class. Acceptance of this status has been difficult for it.

بمبئی کے مسٹر اروند دیشں پانڈے نے موضوع پر ایک تقریر کی۔ اس کے علاوہ انھوں نے ایک پمفلٹ تقسیم کیا۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ ہندستان کے کیمونل مسئلہ کو حل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ مسلمان ہندستانی ایتھوز کو مانیں اور یہاں کے مذہب، عقائد، روایات اور ہندو ہیروؤں کا احترام کریں۔ اسی طرح ہندوؤں کو چاہئے کہ وہ قوم کو ذات، زبان، نسل، فرقہ وغیرہ سے اوپر

رکھیں:

Muslims should accept the Indian ethos and respect for the faith, beliefes, heritage and heroes of Hindus.
Hindus must put the nation above caste, language, race, sect, etc.

سیمنار میں ایک صاحب کی تقریر مجھے پسند آئی۔ وہ بڑودہ شہر سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا نام و پتہ یہ ہے:

G.N. Devy, Department of English
M.S. University, Baroda 390 002

انھوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ کانفلکٹ بھی پارٹ آف لائف ہے۔ اس دنیا میں کانفلکٹ فری سوسائٹی (Conflict-free society) ممکن نہیں ہے۔ اس لئے ہمیں کانفلکٹ کے خلاف شکایت کرنے کے بجائے کانفلکٹ کے ساتھ جینے کا گر سیکھنا چاہئے

پروفیسر امریک سنگھ نے کہا کہ دو قومی نظریہ کا الزام مسٹر محمد علی جناح پر نہیں جاتا۔ کیونکہ سب سے پہلے لالہ لاجپت رائے نے ۱۹۱۶ میں یہ کہا تھا کہ ہندستان میں دو الگ الگ قومیں آباد ہیں۔ ایک ہندو، اور دوسرے مسلمان۔ تاہم یہ بات نہایت عجیب ہے کہ کیوں مسٹر جناح نے اس کی تردید نہیں کی۔ اور اس کے بجائے انھوں نے اسی کو اپنی تحریک کی بنیاد بنالیا۔

ایک صاحب نے کہا کہ ہندستان کے فرقہ وارانہ جھگڑے کی جڑ تاریخی یادیں ہیں۔ مسلمان کے دماغ میں یہ ہے کہ ہم نے ہندستان کے اوپر ایک ہزار سال تک حکومت کی ہے۔ اور ہندوؤں کے دماغ میں ہے کہ مسلمانوں نے یہاں آکر ہمیں ایک ہزار سال تک غلام بنائے رکھا۔

ایک صاحب نے کہا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جو جھگڑے ہیں ان کو ختم کرنے کی صورت یہ ہے کہ سب کا ہیرو ایک ہوجائے۔ مسلمانوں کو ہندوؤں پر اسی طرح فخر ہونے لگے جس طرح خود ہندوؤں کو ہے۔ اس کے بغیر یہ مسئلہ حل ہونے والا نہیں۔

ایک سردار جی نے کہا کہ پارٹیشن نے مسلمانوں کو کچھ نہیں دیا۔ ۱۹۴۷ سے پہلے یہاں مسلمانوں کی پوزیشن ۲۵ فیصد تھی۔ مگر ۱۹۴۷ کے بعد وہ کم ہوکر ۱۰ فیصد پر آگئی۔ انھوں نے مزید کہا کہ ایک وقت آئے گا جب مسلمانوں کو اس کا احساس ہوگا اور اس وقت یہ حال ہوگا کہ جس طرح روس میں لینن کا مجسمہ گرایا گیا

اسی طرح مسٹر جناح بھی مسلمانوں کی نظر میں حقیر ہو کر رہ جائیں گے۔

سمینار ۵ بجے شام کو ختم ہو گیا۔ اس کے بعد ہم لوگ پریانند ساہتیہ سدن کے لئے روانہ ہوئے۔ میرے علاوہ مسٹر بندوق والا، مسٹر مدھومہتا، مسٹر اروند دیش پانڈے بھی ساتھ تھے۔ راستہ میں ملکی مسائل پر باتیں ہوتی رہیں۔

مسٹر اروند دیش پانڈے نے بتایا کہ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ سے پہلے جسٹس کھنا نے مسٹر لال کرشن آڈوانی سے کہا تھا کہ "دیکھو آڈوانی، ایسا کوئی کام نہ کرنا کہ میرے جیسے ہندو کو انڈیا میں رہتے ہوئے شرم آئے۔" مسٹر پانڈے نے بتایا کہ بھاجپا کے ایک لیڈر سے ان کی ایک گھنٹہ تک بات ہوئی۔ ان کی باتوں کا وہ جواب نہ دے سکے۔ آخر میں مسٹر اروند دیش پانڈے نے ان سے کہا: "آئندہ جب انڈیا کی ہسٹری میں آپ کا نام درج کیا جائے گا تو آپ کے خانہ میں صرف دو کارنامہ لکھا جائے گا ایک یہ کہ مہاتما گاندھی کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ دوسرے یہ کہ آپ نے تاریخی بابری مسجد کو ڈھا دیا۔"

پریانند ساہتیہ سدن کے ہال میں میری تقریر کا پروگرام رکھا گیا تھا۔ وسیع ہال پورا کا پورا بھرا ہوا تھا۔ نشست کا انتظام فرش پر کیا گیا تھا۔ اس جلسہ کا اعلان میرے نام کے ساتھ مقامی گجراتی اخبارات میں کر دیا گیا تھا۔ کافی لوگ اس میں شریک ہوئے۔ شرکا میں ہندوؤں کے علاوہ مسلمان بھی موجود تھے۔

میں نے اپنی تقریر میں کہا کہ اسلام کا خلاصہ یہ ہے کہ آدمی کو مثبت سوچنے والا (Positive thinker) بنایا جائے۔ یعنی وہ انسان جو خلاف مزاج باتوں پر نہ بھڑکے۔ جو ناموافق چیزوں کے درمیان معتدل طور پر رہ سکے۔ حتی کہ اس کے اندر یہ صلاحیت ہو کہ وہ اپنے مائنس کو پلس میں تبدیل کر دے۔ تفصیلی تقریر میں مختلف مثالوں سے اس حقیقت کو واضح کیا۔

صدر جلسہ ایک مقامی ہندو تھے۔ انھوں نے آخر میں بولتے ہوئے میری تقریر پر اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا کہ "جب مولانا صاحب بول رہے تھے تو ایسا معلوم پڑتا تھا جیسے مہان رشی بول رہا ہے۔"

جلسہ کے بعد اسٹیج سے اترا تو مختلف لوگوں نے اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ کچھ مسلم نوجوانوں نے آٹوگراف لیا۔ ادھیڑ عمر کے ایک مسلمان جو ٹوپی پہنے ہوئے تھے اور جن کے چہرے پر داڑھی بھی تھی،

انھوں نے قریب آکر پوچھا : آپ کا رسالہ ابھی نکل رہا ہے۔ اس عجیب سوال کا میں کوئی جواب نہ دے سکا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کہ وہ پوچھ رہے ہوں : " آپ کی موت ابھی واقع نہیں ہوئی " مذکورہ بزرگ کی طرف میں نے حیرانی کے ساتھ ایک نظر ڈالی اور پھر ان کو سلام کرکے خاموشی کے ساتھ گاڑی میں سوار ہوگیا جو مجھ کو قیام گاہ لے جانے کے لئے وہاں کھڑی ہوئی تھی۔

۱۴ نومبر کی صبح کو نیند کھلی تو باہر پھیلے ہوئے درختوں کی قطاروں سے مختلف چڑیوں کی آوازیں آنے لگیں۔ کوّا، کوئل اور بلبل وغیرہ۔ صبح کے سہانے میں یہ آوازیں عجیب کیفیت پیدا کررہی تھیں۔ میں نے سوچا کہ خدا کے باغ میں کوّے کی کائیں کائیں بھی ہے اور بلبل کے چہچہے بھی۔ یہاں کوئل کی کوک بھی ہے اور فاختہ کی غٹرغوں بھی۔ یہ خدا کی تخلیقی اسکیم ہے۔ اب جو لوگ انسانی زندگی میں یکسانی لانے کے لئے اس کے اوپر اپنا کلچرل رولر چلانا چاہتے ہیں وہ خدا کی تخلیقی اسکیم کی نفی کرنا چاہتے ہیں۔ ایسا منصوبہ فطرت کے خلاف ہے، اور جو چیز فطرت کے خلاف ہو وہ خدا کی اس دنیا میں کبھی کامیاب ہونے والی نہیں۔

۱۴ نومبر کی صبح کو ناشتہ کی میز پر پروفیسر رشید الدین خاں (جامعہ ہمدرد، نئی دہلی) کا ساتھ تھا۔ انھوں نے بتایا کہ جواہرلال نہرو کو اقبال کے یہ معنی خیز اشعار بہت پسند تھے، اور وہ اکثر ان کو اپنی تقریروں میں دہرایا کرتے تھے :

یونان ومصر وروما سب مٹ گئے جہاں سے — اب تک مگر ہے باقی نام ونشاں ہمارا
کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری — صدیوں رہا ہے دشمن دورِ زماں ہمارا

انڈین ایکسپریس کے بروڈہ اڈیشن (۱۴ نومبر ۱۹۹۴) میں ایودھیا ورڈکٹ پر مسٹر کلدیپ نائر کا ایک مضمون چھپا ہوا تھا۔ اس میں انھوں نے لکھا تھا کہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہندو یہ دعویٰ کرتے ہیں بابری مسجد کے مقام پر ایک رام مندر تھا، اس کو توڑ کر عین اسی مقام پر مسجد بنائی گئی۔ مسلمان اس دعویٰ کو چیلنج کرتے ہیں۔ اس معاملہ میں وہ اس حد تک گئے ہیں کہ وہ کہتے ہیں کہ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ مسجد بنانے کے لئے مندر کو ڈھایا گیا تھا تو وہ خود اس کو چھوڑ دیں گے۔ اب سوال یہ ہے کہ کون اس کو طے کرے کہ وہاں کون سی عمارت موجود تھی، مندر یا مسجد۔

They (Muslims) have gone to the extent of saying that if it is proved that the temple was destroyed to raise the mosque, they would themselves disown it. Who is to decide? Which structure was there initially: temple or mosque?

مسٹر کلدیپ نایر یہاں اس واقعہ کا ذکر کرنا بھول گئے جو ۲۷ مارچ ۱۹۸۷ کو نئی دہلی کے وٹھل بھائی پٹیل ہاؤس میں پیش آیا تھا۔ یہاں بابری مسجد اور رام مندر کے سوال پر ایک مشترکہ میٹنگ ہوئی تھی جس میں خود مسٹر کلدیپ نایر بھی موجود تھے۔ اس میں ہندو سائڈ اور مسلم سائڈ دونوں طرف کے لوگ شریک ہوئے۔ یہ بحث کلیم اور کاونٹر کلیم کی صورت میں دیر تک چلتی رہی۔ آخر میں میں نے کہا کہ اس طرح کی بحث سے تو کوئی فائدہ ہونے والا نہیں۔ درست طریقہ یہ ہے کہ ثالثی (آربٹریشن) کے اصول پر اس کو حل کیا جائے۔ میں نے کہا کہ تاریخ دانوں کا ایک بورڈ بنا دیا۔ یہ بورڈ تاریخی جائزہ لے کر جس نتیجہ تک پہنچے اس کو دونوں فریق مان لیں۔

اس تجویز سے کلدیپ نایر سمیت، شرکاء کی اکثریت نے اتفاق کیا۔ قریب تھا کہ وہ اتفاق رائے سے منظور ہو جائے کہ عین اسی وقت بابری مسجد ایکشن کمیٹی کے کنوینر صاحب نے بآواز بلند کہنا شروع کیا کہ ہم اس تجویز کو نہیں مانتے۔ اس کے بعد انھوں نے اتنا شور مچایا کہ مزید گفتگو جاری رکھنا ناممکن ہو گیا۔ چنانچہ مجلس چائے کے لئے اٹھ گئی اور کوئی بات طے نہ ہو سکی۔

میرے کمرہ میں ایک ٹی وی سیٹ رکھا ہوا تھا، مگر میں نے اس کو کبھی نہیں کھولا۔ ۱۴ نومبر کی صبح کو روانگی کے وقت تجربہ کے لئے میں نے اس کی سوئچ دبا دی تو اسکرین پر روشن حروف میں ہندی، اردو، انگریزی میں یہ الفاظ لکھ اٹھے:

نمستے جی، خوش آمدید، ہیلو۔

یہ انتظام شاید اس لئے ہوگا کہ آنے والا آدمی جب کمرہ میں داخل ہو کر اس کو کھولے تو وہ نئے آنے والے کو گیسٹ ہاؤس کی طرف سے استقبال کا کلمہ پیش کر سکے۔ مشین نے اپنا کام کیا۔ مگر مشین کو یہ معلوم نہ تھا کہ اس وقت اسے اپنے مہمان کو الوداع کہنا ہے نہ کہ خوش آمدید۔

مشینی دماغ اور انسانی دماغ کا فرق یہی ہے۔ مشینی دماغ فیڈ کئے ہوئے سبق کو دہراتا ہے، جب کہ انسان خود اپنی سوچ کے تحت اپنا جواب وضع کرتا ہے۔

۱۴ نومبر کو واپسی کا دن تھا۔ صبح چائے سے فارغ ہونے کے بعد میں اور پروفیسر رشید الدین

صاحب ایک ساتھ روانہ ہوئے۔ ہماری گاڑی بڑودہ کی مختلف سڑکوں سے گزر رہی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف کہیں امیری کے مناظر تھے اور کہیں غریبی کے مناظر۔ میں نے سوچا کہ آدمی کا حال بڑا عجیب ہے اگر وہ غریب ہو تو پست ہمت ہو جاتا ہے۔ اور اگر وہ خوش حال ہو تو گھمنڈ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ وہ نہ امیری میں معتدل رہتا ہے اور نہ غریبی میں۔

راستہ میں پروفیسر رشید الدین صاحب کی باتیں سنتا رہا۔ ان کی معلومات وسیع ہیں اور حافظہ بھی اچھا ہے۔ وہ چالیس سال کا تعلیمی تجربہ رکھتے ہیں۔ اسی کے ساتھ وہ نہایت وضع دار ہیں۔ ہم لوگ گیسٹ ہاؤس سے نکلے تو انھوں نے وہاں کے آدمی کو حسب قاعدہ ٹپ دی۔ اسی طرح ایئرپورٹ پہنچے تو یہاں بھی وہ ڈرائیور کو ٹپ دینا نہیں بھولے۔

رشید الدین صاحب ۱۹۷۹ میں پاکستان گئے تھے۔ وہاں کے بارہ میں بہت سے لطیفے سناتے رہے۔ انھوں نے کہا کہ پاکستان میں ایک شاعر ہیں۔ ان کا تخلص فارغ ہے۔ ان کا ایک شعر رونگٹے کھڑے کر دینے والا ہے۔ پاکستانی تجربہ کے بعد ہی یہ شعر نکل سکتا ہے:

اب تو یوں لگتا ہے فارغ کہ معاذ اللہ   جیسے اسلام یزیدوں کے لئے آیا ہو

انھوں نے دو شعر سنایا جو ان کے الفاظ میں گویا اس ملک میں اردو اور مسلمان دونوں کی کہانی کا خلاصہ ہے۔ ۱۹۰۵ میں داغ دہلوی نے فخر کے ساتھ کہا تھا:

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ   ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

آج کیا حال ہے، اس کا اظہار مجروح سلطانپوری کے ایک شعر سے ہوتا ہے۔ ان کی ایک نظم کا یہ شعر اردو زبان کی موجودہ حالت کی تصویر ہے:

زباں ہماری نہ سمجھا یہاں کوئی مجروح   ہم اجنبی کی طرح اپنے ہی وطن میں رہے

ایک اور شعر انھوں نے شاہد صدیقی کا سنایا۔ وہ حیدرآبادی تھے اور جگر مرادآبادی کے شاگرد تھے۔ انھوں نے اپنی ایک نظم میں کہا:

مجھے رہبروں سے ہے یہ گلہ کہ انھیں شعور نظر نہ تھا   کبھی راستوں میں الجھ گئے کبھی منزلوں سے گزر گئے

اس طرح بات کرتے ہوئے ہم لوگ ایئرپورٹ پہنچ گئے۔ بڑودہ سے انڈین ایئرلائنز کی فلائٹ ۸۱۷ کے ذریعہ دہلی کے لئے روانگی ہوئی۔ یہ ایک ہی پرواز ہے جو دہلی - احمد آباد - بڑودہ - دہلی کے درمیان

روزانہ چلتی ہے۔

راستہ میں انڈین ایئرلائنز کی فلائٹ میگزین سواگت (نومبر ۱۹۹۴) دیکھا۔ اس کے ہندی حصہ میں پہلا مضمون تھا ——— مہان صوفی سنت، حضرت نظام الدین اولیاء۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ دہلی کی مرکزی حکومت میں جو شخص بھی پرائم منسٹر بنتا ہے، وہ درگاہ نظام الدین جاکر وہاں چادر ضرور چڑھاتا ہے۔ کیوں کہ عام عقیدہ یہ ہے کہ حضرت نظام الدین کی مرضی کے بغیر کوئی شخص دہلی پر حکومت نہیں کرسکتا۔ چنانچہ وہ سلطان جی کہے جاتے ہیں۔ حضرت نظام الدین اولیاء ۱۲۳۸ء میں پیدا ہوئے اور ۱۳۲۷ء میں ان کا انتقال ہوا۔ مضمون میں بتایا گیا تھا کہ انھوں نے سب کو ہمیشہ مانو پریم کا سندیش دیا (صفحہ ۲۹)

انگریزی میں ایک مضمون مسٹر ہومی جے وکیل کے قلم سے تھا، اس کی تصویریں مسٹر وی بالو نے فراہم کی تھیں۔ اس کا موضوع تھا تلاش امن:

In search of Peace

اس مضمون میں اقوام متحدہ کے ادارۂ امن کے لٹریچر سے ایک جملہ نقل کیا گیا تھا۔ اس میں کہا گیا ہے کہ چوں کہ جنگیں لوگوں کے دماغ میں شروع ہوتی ہیں، اس لئے انسانی دماغ ہی سے ہمیں امن قائم کرنے کی کوششوں کا آغاز کرنا چاہئے:

Since wars begin in the minds of men, it is there that we must begin to construct the defences of peace. (p. 12)

پرامن سماج بنانے کا ذریعہ پرامن انسان بنانا ہے۔ جب تک پرامن سوچ والے انسان وجود میں نہ آئیں پرامن سماج کا وجود بھی ممکن نہیں۔

۱۴ نومبر ۱۹۹۴ کی دوپہر کو جہاز دہلی کے ہوائی اڈہ پر اتر گیا۔ میں جہاں سے چلا تھا، میں دوبارہ واپس آگیا۔ یہی معاملہ پوری زندگی کا ہے۔ آدمی آخرت سے نکل کر دنیا میں آتا ہے اور دوبارہ پھر وہ آخرت کی طرف واپس چلا جاتا ہے۔ دنیا میں ہماری واپسی پردیس سے گھر کی طرف ہوتی ہے، آخرت میں ہماری واپسی عمل کی دنیا سے انجام کی دنیا کی طرف ہوگی۔

واپسی کے بعد بڑودہ سے چند خطوط ملے۔ مسز الکنندا پٹیل (Tel. 0265-339026) جو سمینار

کی آرگنائزر تھیں، ان کے خط مورخہ ۲۰ نومبر ۱۹۹۴ کا ایک حصہ یہاں نقل کیا جاتا ہے۔ انھوں نے اردو میں اپنا خط لکھنے کی کوشش کی۔ پہلی سطر میں لکھا "عزیز مولانا صاحب، آداب" اس کے بعد اس طرح انگریزی میں شروع کیا:

Unfortunately, my Urdu writing does not go beyond this. So I will continue in English. It is difficult for me to express how grateful we are that you came for the seminar last Sunday. For all of us it was a special blessing and I would not belittle the experience of hearing you and being with you by trying to thank. Both the Rajiv Gandhi Institute and we in Baroda are very keen that a volume containing a few papers and the proceedings should come out soon. It will be wonderful for us if you write a piece, even a short one. An article from you will mean so much.

۱ حیدر آباد میں تعلیم یافتہ افراد کا ایک فورم پرجنا بھارتی ہے۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے حیدر آباد کا سفر کیا۔ وہاں ان کے دو خطاب ہوئے (۱) لِونگ وِدھ اسلام اِن انڈیا۔ (۲) مسلم ایجنڈا۔ اس سلسلہ میں ورنگل، بیدر اور رون پرتی کا بھی سفر ہوا اور وہاں بھی عمومی خطابات ہوئے۔ اس کی روداد ان شاء اللہ سفرنامہ کے تحت الرسالہ میں شائع کر دی جائے گی۔ یہ سفر یکم جولائی ۱۹۹۵ کو شروع ہوا اور ۶ جولائی کو واپسی ہوئی۔

۲ مسٹر انیل ساری اور مسٹر ایس این سنہا نے ۷ جولائی ۱۹۹۵ کو انگریزی ہفت روزہ ایشیا ویک کے لئے صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر مسلمانوں کے سیاسی فکر سے تھا۔

۳ ارن کول پروڈکشن (نئی دہلی) کی ٹی وی ٹیم نے ۱۱ جولائی ۱۹۹۵ صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو ریکارڈ کیا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ اغوا کرنے کا طریقہ اسلام میں جائز نہیں۔ حدیبیہ معاہدہ میں ایک دفعہ یہ تھی کہ اگر کوئی مسلمان مشرکین مکہ کے ہاتھ لگ جائے تو وہ اس کو واپس نہیں کریں گے۔ لیکن اگر کوئی مشرک مدینہ کے مسلمانوں کو مل جائے تو وہ اس کو واپس کر دیں گے۔ اس دفعہ سے معلوم ہوا کہ فریق ثانی اگر مسلمان کو ہاسٹج بنا رہا ہو تب بھی مسلمان کسی غیر مسلم کو ہاسٹج نہیں بنائیں گے۔

۴ انڈین ٹیلیویژن ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ (نئی دہلی) کی ٹیم نے ۱۳ جولائی ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو ریکارڈ کیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر کامن سول کوڈ سے تھا۔ جوابات کا خلاصہ یہ تھا کہ کامن سول کوڈ کا نفاذ نہ ممکن ہے اور نہ مفید۔

۵ نوبھارت ٹائمس کے نمائندہ مسٹر گلشن رائے کھتری نے ۲۹ جون ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ مذہب کی بنیاد پر حکومت قائم کرنا اس طرح نہیں ہو سکتا کہ آپ کسی نہ کسی طرح سیاسی اقتدار پر قبضہ کر لیں اور اس کے بعد ڈنڈے کے زور پر مذہبی قانون نافذ کرنا شروع کر دیں۔ ایسا کرنے سے مذہبی نظام نہیں آئے گا۔ بلکہ فساد اور تخریب کا نظام آئے گا۔ جو لوگ مذہبی نظام قائم کرنا چاہیں ان کے لئے

نقطۂ آغاز سیاسی اقتدار پر قبضہ نہیں ہے۔ بلکہ عوام کا مزاج بنانا اور سماج سدھارلانا ہے۔

۶   ۱۶ جولائی ۱۹۹۵ کو انڈیا انٹرنیشنل سنٹر (نئی دہلی) میں ایک سمینار ہوا۔ اس کا موضوع ساؤتھ ایشیا (انڈیا، پاکستان، بنگلہ دیش، سری لنکا، نیپال، مالدیپ، بھوٹان) کے درمیان کوآپریشن کے مسائل پر غور کرنا تھا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور موضوع پر ایک تقریر کی اور گفتگو میں حصہ لیا۔ انھوں نے تجویز پیش کی کہ ساؤتھ ایشیا کا ایک کنفیڈریشن بننا چاہئے۔

۷   راجیو گاندھی فاؤنڈیشن (نئی دہلی) کے زیر اہتمام ۲۸ جولائی ۱۹۹۵ کو ایک آل انڈیا سمینار ہوا۔ اس کا موضوع تھا: کیمونل وائلنس ان انڈیا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور انگریزی میں ایک پیپر پیش کیا۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ فرقہ وارانہ تشدد کو حکمت اور ضبط وتحمل کے ذریعہ کنٹرول کیا جاسکتا ہے۔

۸   یونی فیکیشن اینڈ ورلڈ پیس کی طرف سے ۳۰ جولائی ۱۹۹۵ کو گاندھی آڈیٹوریم (نئی دہلی) میں ایک سمینار ہوا۔ اس کا موضوع تھا: ورلڈ پیس تھرو آئیڈیل فیمیلیز (معیاری خاندانوں کے ذریعہ عالمی امن)۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور قرآن کی آیت خلق لکم من انفسکم ازواجاً لتسکنوا الیها وجعل بینکم مودّة ورحمة (الروم ۲۱) کی روشنی میں ایک تقریر کی۔

۹   نئی دنیا (دہلی) کے نمائندہ جناب عقیدت اللہ قاسمی نے ۵ اگست ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق اس مسئلہ سے تھا کہ ۱۹۴۷ سے پہلے علماء نے تقسیم ملک کی مخالفت کیوں کی۔ اور یہ کہ اسلامی نقطۂ نظر سے تقسیم کا طریقہ مناسب تھا یا نہیں۔

۱۰   نئی دہلی کے انگریزی اخبار آبزرور کے نمائندہ مسٹر سریش نوٹیال نے ۵ اگست ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر اس مسئلے سے تھا کہ ہندستان میں نیشنل سوچ اور نیشنل کیرکٹر کی حالت کیا ہے اور اس کو کس طرح ترقی دی جاسکتی ہے۔

۱۱   جھروکا ویڈیو میگزین (گوڑگاؤں) کی ٹیم نے ۶ اگست ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز کا

ویڈیو انٹرویو ریکارڈ کیا۔ سوالات کا تعلق مسلمانان ہند کے مسائل سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں بتایا گیا کہ مسلمانوں کے مسائل کا سبب کوئی خارجی ظلم یا تعصب نہیں ہے۔ اس کا سبب تمام تر یہ ہے کہ ناقص رہنمائی نے مسلمانوں کے اندر حقیقت پسندانہ سوچ پیدا نہیں کیا۔ جب کہ تمام مسائل کا واحد حل حقیقت پسندانہ عمل ہے۔

۱۲ آل انڈیا پروہبشن کونسل کی طرف سے ۹ اگست ۱۹۹۵ کو ماؤلنکر ہال (نئی دہلی) میں ایک سمینار ہوا۔ یہ شراب بندی کے موضوع پر تھا۔ اس کا عنوان تھا "شراب چھوڑو، دیش جوڑو" اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ انھوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ اسلام میں شراب کو ام الخبائث کہا گیا ہے۔ یعنی تمام برائیوں کی جڑ۔ ملک کی اصلاح کے لئے شراب کو بند کرنا ضروری ہے۔ شراب کو تمام مذہبوں میں برا بتایا گیا ہے۔ اسلام میں اس کے لئے کڑی سزا مقرر کی گئی ہے۔

۱۳ ہندی روزنامہ جن ستہ (دہلی) کے نمائندہ مسٹر صفدر رنے ۱۶ اگست ۱۹۹۵ کو ٹیلیفون پر صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ ایک سوال کے جواب میں بتایا گیا کہ فرقہ وارانہ جھگڑوں سے بچنے کی سب سے زیادہ موثر تدبیر یہ ہے کہ جب بھی کوئی نزاع پیدا ہو تو باہر کے لیڈروں کو اس میں دخل دینے سے روکا جائے اور مقامی ہندو اور مسلمان آپس میں بات چیت کرکے معاملات کو طے کرلیں۔

۱۴ کرنال (سکندر پور ماجرا) میں ۲۰ اگست ۱۹۹۵ کو "لائبریری اندولن" کے عنوان سے ایک جلسہ ہوا۔ اس کا مقصد گاؤں میں لائبریری اور ریڈنگ روم قائم کرنا تھا۔ اس کے آرگنائزر شری مول چند جین کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور مطالعہ اور حصول علم کے موضوع پر تقریر کی۔

۱۵ مسٹر ارن کمار ترپاٹھی نے ۲۴ اگست ۱۹۹۵ کو روزنامہ لوک مت سماچار (ناگپور) کے لئے صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر ملک کے مسائل سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ ملک کو جس المناک حالات میں آزادی ملی وہ گویا ایک قسم کا قومی ایکسیڈنٹ تھا۔ سڑک کے حادثات میں لوگ زخمی ہوتے ہیں لیکن ڈاکٹر انھیں دوبارہ اچھا

کر لیتے ہیں۔ یہ ہمارے پولیٹکل ڈاکٹروں کی ناکامی ہے کہ پچاس سال گزرنے بھی وہ قوم کو دوبارہ صحت مند نہ بنا سکے۔

۱۶ یو این آئی (ہندی) کی خاتون نمائندہ انّا پورنا جھا نے ۲۶ اگست ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق مسلم مسائل سے بھی تھا اور ملکی مسائل سے بھی۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ ہندو اور مسلمان عام طور پر مل جل کر ہی رہتے ہیں۔ یہ کچھ اخبار اور کچھ لیڈر ہیں جو نفرت کی باتیں کر کے دوری پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر دونوں فرقوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے تو فطرت ان کی رہنمائی کرے گی۔ اور فطرت کبھی غلط رہنمائی نہیں کرتی۔

۱۷ یورپ کے ایک مسیحی ادارہ کے زیر اہتمام ۳۰ - ۳۱ اگست ۱۹۹۵ کو یروشلم میں ایک انٹرنیشنل مذہبی کانفرنس ہوئی۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے یروشلم (فلسطین) کا سفر کیا اور وہاں "پالیسی آف پیس اِن اسلام" کے موضوع پر مقالہ پیش کیا۔ اس سفر کی روداد انشاءاللہ الرسالہ میں شائع کر دی جائے گی۔

۱۸ حلقۂ الرسالہ کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے بمبئی کا سفر کیا۔ وہاں یکم ستمبر ۔ ۳ ستمبر ۱۹۹۵ قیام رہا۔ وہاں دیگر پروگراموں کے علاوہ دو گھنٹہ کی ایک تقریر ہوئی جس کا عنوان تھا: "مسائل ملت کا حل سیرت کی روشنی میں"۔ اس تقریر کی ویڈیو ریکارڈنگ کی گئی۔ یہ ویڈیو کیسٹ مندرجہ ذیل پتہ سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

اسلامک ریسرچ فاؤنڈیشن ، ۵۶ تانڈیل اسٹریٹ (نارتھ) ڈونگری ، بمبئی ۴۰۰۰۰۹

۱۹ انسٹی ٹیوٹ آف گاندھین اسٹڈیز (واردھا) کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے وہاں کا سفر کیا۔ اور ۱۸ ستمبر ۱۹۹۵ کو ملکی اور غیر ملکی نوجوانوں کے ایک اجتماع سے خطاب کیا۔ اس سلسلہ میں انھوں نے دو لکچر دئے اور اسلام سے متعلق کثیر تعداد میں سوالات کا جواب دیا۔ یہ پورا پروگرام انگریزی زبان میں ہوا۔ لکچروں کا عنوان یہ تھا:

1. The Spiritual Goal of Islam
2. Behaviour of a Muslim in his Environment